انعام یافتہ

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے

(چند یادیں)

منزّہ سلیم

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے

منزّہ سلیم

مثال

منزّہ سلیم

۱۳ جنوری ۱۹۵۱ء کو لاہور میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۷۳ء میں زرعی یونیورسٹی لائل پور سے رورل سوشیالوجی میں ایم۔ ایس۔ سی کی۔ زمانۂ طالب علمی میں یونیورسٹی کے مجلّہ کے اُردو حصہ کی ایڈیٹر رہیں۔ ۷۲۔۱۹۷۱ء میں یونیورسٹی کی بہترین نثرنگار کا انعام حاصل کیا۔ انھیں، حلقۂ اربابِ ذوق لائل پور کی پہلی خاتون رُکن ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ حلقہ کی مختلف نشستوں میں افسانے اور مزاحیہ مضامین پڑھتی رہیں۔

آج کل گورنمنٹ اسلامیہ کالج برائے خواتین فیصل آباد میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور ہیڈ آف سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے طور پر کام کر رہی ہیں۔ ۲۰۰۶ء میں ان کی پہلی کتاب ''پھول لاکھوں برس نہیں رہتے'' منظرِ عام پر آئی جسے ادبی حلقوں میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ اور تعلیمی بورڈ فیصل آباد کی طرف سے انعام کی حق دار ٹھہری۔

۲۰۱۰ء میں ان کی دوسری کتاب ''ادھوری عورت'' (ناول) شائع ہوئی جو کہ ایک کینسر گزیدہ عورت کی کہانی ہے۔

۔ ادارہ

زیرِ تصنیف

۱۔ میرا قبلہ تے کعبہ
(بھائی کی یاد میں)

۲۔ بنامِ دین و دانش

۳۔ تھرسٹی کرو (Thirsty Crow)
(ناولٹ)

Misaal PUBLISHERS
misaalpb@gmail.com
Ph:+92-41-2643841, Cell:0300-6668284
ISBN:978-969-581-068-2
9789695810682

معنون کی عرض داشت

اگر کوئی کتاب کسی کے نام کر دی جائے تو وہ طلیپ لکھنے نہیں بیٹھ جاتا، منزّہ نے آپا سے کہا کتاب آپ کے اور ڈاکٹر بھائی کے نام کی ہے۔ کہنے لگیں ''رہن دے اصغر دے ناں کر دے'' اصغر۔۔۔ یعنی بڑے بھائی۔ جنھیں گئے ہوئے تین برس بیت گئے ہیں۔ زندہ ہوتے تو معنون پر بحث چھڑ جاتی دو تین دِن یہ بحث چلتی کہ لفظ مُعن۔وَن ہے یا مَع۔نون فیصلہ ہوتا کہ مُعن۔وَن ہی صحیح ہے۔ مگر مَع۔نون چلتا ہے اور اچھا لگتا ہے۔ چلنے دو۔

ٹیپ ریکارڈر اور سی ڈی کی ایجاد سے پہلے منزّہ گھر بھر کا ٹیپ ریکارڈر تھی۔ کوئی واقعہ، کتنے سال پرانہ ہو، اُسے درمیان میں بٹھا کر سن لو۔ یہ بھی اس گھر کا ایک معمول تھا۔

دیکھنے والے جانتے ہیں، سننے والے پوچھتے ہیں، کہ یہ گھر جو عام گھروں جیسا تھا، اُس میں خوشیاں بہت تھیں۔ پھر قدرت نے اُس کا اُلٹ دِکھایا۔ پیار کم نہ ہوا۔ بہت پیار کرنے والے لوگ تھے اور توقع ہے کہ

All the World Loves a Lover

کے مصداق آپ کو یہ لوگ، یہ دُنیا پسند آئے گی، عام لوگوں کے عام سے، سچے جذبے۔ منزّہ نے یہ تصویر کیسے بنائی، وہی جانتی ہے، ہم آپ نہیں۔

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے

(چند یادیں)

فرخ منظور صاحب کے لیے

/

منزّہ سلیم

اگست ۲۰۱۶

منزّہ سلیم

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے

(چند یادیں)

منزّہ سلیم

مثال پبلشرز
رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ ©

طلوعِ اوّل مئی 2006ء
دوم فروری 2007ء
سوم ستمبر 2010ء

کتاب پھول لاکھوں برس نہیں رہتے (چند یادیں)

مصنفہ منزّہ سلیم
ہاؤس نمبر 76، سٹریٹ نمبر 2، شادمان ٹاؤن،
سرگودھا روڈ، فیصل آباد، فون: 041-8789494

ناشر محمد عابد

سرورق اصبح عاصم

مطبع شرکت پریس، لاہور

تعداد 1000

قیمت 250 روپے

اہتمام مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد
Ph:2615359 -2643841 Mob:0300-6668284
E-mail:misaalpb@gmail.com

انتساب

آپا اور ڈاکٹر بھائی کے نام

جو

ان یادوں کے حصّہ دار ہیں

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے

گزرے ہوئے دِنوں کا شمار کرنا
اخبارِ ماضی سنانا
جو گزر گئے انہیں ڈھونڈنا، کہ وہ کہاں ہیں؟
اور دِل کو اس طرح زندہ رکھنا
کبھی مرنے نہ دینا

نہج البلاغہ
علیؓ ابنِ ابی طالب

معنون کی عرض داشت

اگر کوئی کتاب کسی کے نام کردی جائے تو وہ فلیپ لکھنے نہیں بیٹھ جاتا، منزّہ نے آپا سے کہا کتاب آپ کے اور ڈاکٹر بھائی کے نام کی ہے۔ کہنے لگیں ”رہن دے اصغر دے ناں کر دے“ اصغر۔۔۔ یعنی بڑے بھائی۔ جنہیں گئے ہوئے بیس برس بیت گئے ہیں۔ زندہ ہوتے تو معنون پر بحث چھڑ جاتی دو تین دِن یہ بحث چلتی کہ لفظ مُعن۔وَن ہے یا مَع۔نون فیصلہ ہوتا کہ مُعن۔وَن ہی صحیح ہے۔ مگر مَع۔نون چلتا ہے اور اچھا لگتا ہے۔ چلنے دو۔

ٹیپ ریکارڈر اور سی ڈی کی ایجاد سے پہلے منزّہ گھر بھر کا ٹیپ رکارڈر تھی۔ کوئی واقعہ، کتنے سال پرانہ ہو، اُسے درمیان میں بٹھا کر سن لو۔ یہ بھی اس گھر کا ایک معمول تھا۔

دیکھنے والے جانتے ہیں، سننے والے پوچھتے ہیں، کہ یہ گھر جو عام گھروں جیسا تھا، اُس میں خوشیاں بہت تھیں۔ پھر قدرت نے اُس کا اُلٹ دِکھایا۔ پیار کم نہ ہوا۔ بہت پیار کرنے والے لوگ تھے اور توقع ہے کہ

All the World Loves a Lover

کے مصداق آپ کو یہ لوگ، یہ دُنیا پسند آئے گی، عام لوگوں کے عام سے، سچے

جذبے۔ منزّہ نے یہ تصویر کیسے بنائی، وہی جانتی ہے، ہم آپ نہیں۔

انہیں کیا خبر کسی دھنک سے میرے
رنگ لے آئے
انہیں کیا خبر کون سی تتلیوں کے پروں سے
انہیں کیا خبر کون سے حسن سے
کون سی ذات سے، کس خدوخال سے
میں نے کوزوں کے چہرے اُتارے

یہی وہ ندا جس کے پیچھے حسن نام کا یہ جواں
کوزہ گر بھی
پیا پے رواں ہے زماں سے زماں تک

میں ہوں اس کہانی کا ڈاکٹر بھائی

مقبول اختر

فہرست

پیار کا ساون 13
مجھے سب سے زیادہ پیار کس سے ہے؟ 14
حویلی راجہ دھیان سنگھ 16
ریاضت 18
'انوکھی لاڈلی' 19
باوا آدم کی ہم عُمر 21
اُداس بُلبل 23
کُو۔۔۔کُو۔۔۔ 25
'مواقع' 26
قسمت پُڑی 27
مجھے ابھی تک شبہ ہے 29
رات گہری ہو جاتی 30
''اللہ دی سپرد'' 32
''بیٹی کا خط مِلا'' 33
کہانیوں کی کتاب 34
اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے 35
'موتی موڑ' 36
ڈھونڈلو 37
قاتل یادیں 38
بچا کھچا میٹریل اور اُونٹ کا غبارہ 39

مجھ کو شکوہ ہے میرے بھائی---	40	تاروں کی برات	42
قسمیں وعدے	43	سرخ سرخ---نارنجی، زعفرانی---یاقوتی	45
تخم ملنگاں	47	ہفتہ بھر کی کریم	48
'تلخ' یاد	49	ابابیل	51
آفیسر کلاس وَن	52	ریت کے محل	53
چاند پر قدم	55	جُھلنگا	57
پیچُو	58	دیکھنا سرکس کا	60
وقت کا دھارا	61	نور بانو	62
لے پالک	64	بالائی والا دودھ	66
ہچ---ہچ---ہچکی	67	اندر کا بُو	68
یاد---دریچہ	69	ادبی پارہ	71
اُمرت دھارے کی چٹنی	72	میلی کچیلی فلورنس نائیٹ انگیل	73
اباجی کی خواہش پوری ہوئی	74	***Noted with pleasure***	76
علم بڑی دولت ہے	78	اِک خواہش ایسی---	82
"تم پاگل ہو"	84	عادت ہی بنالی ہے---	85
فوڈ ٹیکنالوجی	87	ضیافت	89
قیلولہ	90	بہتی قلفیاں	91
گرمیوں کی شاموں میں	92	دو بڑے Event	93
بے پروائیاں	95	بلاضرورت گفتگو اور سلیمانی ٹوپی	97
محبتیں	99	چرخہ	101
آنہ لائبریری اور گلاب جامنیں	102	کشمیری پردادی کا پرتو	104
"باندری"	105	کتر بیونت	106
منحوس ہندسہ	107	احترامِ مذاہب	108
عظمت کے مینار	110	تختے کی آڑ میں	114
محبتوں کی رنگولی	116	صوفہ تو بنوالیں	117
"ملّے کھیر"	118	امّی کی ڈگریاں	119
بھائی کی پہلی کمائی	120	بی بی اور غریبی	121
چاندرات	123	سری لنکا کے نقشے اور بغیر ہلدی کا سالن	125
دوزخ کے مزے	126	***Teeny tiny*** اور ***Biggy Biggy***	128
سگھڑاپا	130	خلیج	132
Independent	134	حُسن پری	135
عیّاشی	137	اصل زر اور سود	140
شرارت	142	محبت کی مہک	143
ہارٹ اٹیک	144	عالم ہستی کی ویرانی	146
شہرِ خموشاں آباد ہو گیا	148	ماہِ شب چاردھم	150
تنگ دستی	151	داڑھی میں کُھجلی	152

ویرانے پہ کیا گزری	153	ترا کیا اصول ہے زندگی	156
چشمِ سُرمہ سا	158	گھُگوں گھُوں---	159
لک ٹُنو ٹُنو---	160	پُتّراں دے موڈھیاں تے	161
کچھ نہیں کھُلتا	162	دردو چھوڑے دا حال	163
لاجونتی	165	مجھے کچھ نہ سوجھا	167

پیار کا ساون

ناسٹیلجیا[ل]---ناسٹیلجیا کیوں؟ ماضی میں جینا کس لیے؟ جانتی ہوں کہ منہ پھیر کر دیکھتے رہنے کو شاید آپ پسند نہ کریں، لیکن اگر ماضی میں

پیار کا ساون ہو
محبتوں کی برسات ہو
قہقہوں کے جھولے ہوں
اور سب ساتھ ہوں

تو کیا اس سے منہ پھیرا جا سکتا ہے؟ زندگی میں اور کس چیز کی ضرورت ہے؟

ل بمعنی 'یادش بخیریا' (اتنا شاندار متبادل یوسفی ہی مہیا کر سکتے ہیں۔)

مجھے سب سے زیادہ پیار کس سے ہے؟

۱۳ جنوری ۱۹۵۱ء کی یخ بستہ رات۔۔۔لیڈی ولنگڈن ہسپتال لاہور میں امّی نے توام بچیوں کو جنم دیا۔ ایک تو تین دِن بعد رُخصت ہوئی اور دوسری میں۔ مجھ سے پہلے، یکے بعد دیگرے تین بھائی اور ان سے بڑی بہن۔۔۔لیکن سب نے مجھے یوں ہاتھوں ہاتھ لیا، جیسے گھر کا پہلا بچّہ ہو۔ بے انتہا پیار اور بے شمار ناز اُٹھائے گئے۔ گھر بھر کا کھلونا بنی رہی۔ میری پیدائش کے بعد امّی بہت بیمار ہو گئیں تو آپا، جو خود ہائی سکول کی طالبہ تھیں، نے مجھ ساڑھے چار پونڈ کی بچّی کو کیسے سنبھالا۔۔۔امّی بارہا مجھے بتایا کرتیں۔ Cow and Gate پر پلنے والی کمزور اور ذہین بچّی گھر بھر کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ چار بہن بھائیوں اور ماں باپ نے جتنا پیار مجھے دیا، اس سے دوگنا میں نے انھیں لوٹایا۔ میں آج تک یہ فیصلہ نہیں کر پائی کہ اپنے گھر میں مجھے سب سے زیادہ پیار کس سے ہے؟ یادداشت اچھی ہونے کی بنا پر، مجھے اپنے بہت چھٹپنے کی باتیں بھی یاد ہیں۔۔۔جس میں ہر طرف محبت کی قندیلیں روشن ہیں۔ ہر موقعہ، ہر لمحہ انھی سے منوّر اور واضح ہے۔ آپا، بہت پیارے کپڑے سی کر پہناتیں۔ گڑیاں بنا کر دیتیں۔ میں انھی کے بستر میں سوتی۔ بھائی لوگوں کے ساتھ مل کر کھیلتی۔ گھر سے باہر کی

دُنیا سے، انھی نے متعارف کروایا۔ ان کی ہر مصروفیت میں، مجھے برابر کی شمولیت حاصل تھی۔ ابا جی مجھے کندھوں پر سواری کرواتے، مجھے پڑھاتے اور میری کارکردگی پر بہت خوش ہوتے، امّی مجھے کچھ نہ کچھ کھلاتے رہنے کے جتن کرتیں۔ مجھے کہانیاں سناتیں میرا منہ چومتیں، ان کے جدا ہونے کے اِتنے سال بعد بھی، مجھے ان کے ہونٹ اپنی گالوں پر محسوس ہوتے ہیں۔

☆ اے ہم نفسانِ محفلِ ما
رفتید ولی نہ از دلِ ما

☆ اے میری محفل کے رفیقو۔۔۔تم چلے گئے مگر میرے دِل سے نہیں گئے۔

حویلی راجہ دھیان سنگھ

چونا منڈی لاہور میں راجہ دھیان سنگھ کی حویلی، میرا پہلا گھر ہوئی۔ نیچے سی۔آئی۔اے سٹاف کا دفتر اور اوپر کا حصہ اباجی کو رہائش کے لیے ملا تھا۔ بہت سی آرام دِہ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک شاہانہ عمارت، سنگِ مرمر اور سنگِ سیاہ کے چوکور ٹکڑوں سے مزیّن فرش والے دو بڑے بڑے ہال کمرے اور ان کے دونوں طرف کمروں کی قطاریں۔۔۔ جن کی چھتیں سرخ اور سنہری کام سے سجے، لکڑی کے چوکھٹوں کی تھیں۔ اونچی چھتوں والے محراب دار برآمدے، لکڑی کے کام والی خوبصورت بالکونی۔۔۔ دونوں طرف بڑے بڑے صحن، اسی گھر میں ہوش سنبھالا۔۔۔ پاؤں پاؤں چلنا سیکھا اور پھر اپنے سے بڑے بھائی کے ساتھ مل کر اس کا چپّہ چپّہ چھان مارا۔ عمارت کی پچھلی جانب بہت بڑا لان تھا جو باقاعدگی سے Maintain کیا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے اس میں ایک طرف بڑا سا Roller پڑا رہتا تھا۔ جس پر ہفتے کے چھ دن میں اور بھائی چڑھتے، اترتے رہتے اور ساتویں دن بیل جوت کر اس سے لان ہموار کیا جاتا۔ اطراف میں اُونچے اُونچے درخت، جن کا پھل جسے 'بل' کہتے تھے، ٹپ ٹپ زمین پر گرتا رہتا۔ درختوں سے چھن چھن کر آنے والی دھوپ چمکدار اور

حِدّت لیے ہوتی لیکن ان کے نیچے کی زمین خنک اور سیلی، جس میں سے اُٹھنے والی خوشبو عجیب اور مسحور کن ہوتی۔ یہ پاکستان بننے کے بعد کا زمانہ تھا، ابھی انگریزوں کا اثر باقی تھا۔ اس لیے دفاتر کے اردگرد کی زمین کو، صاف ستھرا رکھنے کا رواج تھا۔ موسمی پھول حاشیے کی صورت میں، لان کے چاروں طرف لگائے جاتے تھے۔ مارچ میں موسم بدلنا شروع ہوتا تو چمکیلی دھوپ اور ہلکی گرمی میں Sweet Peas کے پھول، سرکنڈوں کی باڑ کے ساتھ لگے جو خوشبو چھوڑتے، اس سے غنودگی طاری ہونے لگتی۔ بے شمار تتلیاں بھی سردیوں کے ٹھکانوں سے نکل کر اس میں ڈولتی پھرتیں۔ میں اور بھائی، دیوانہ وار ان کے پیچھے بھاگتے رہتے۔ پوری بلڈنگ کے اطراف میں بڑے بڑے گراؤنڈ تھے۔ سیڑھیوں کے قریب ہی سنگِ مرمر کا ہشت پہلو حوض تھا جس کے اوپر لکڑی کی سبز رنگ کی کنوپی بنی ہوئی تھی۔ میں اور بھائی آفس ٹائم کے بعد رات کو اس میں نہاتے۔ سنا ہے اس بلڈنگ کے نیچے تہہ خانے بھی تھے۔ بھائی اور میں نے بارہا، ان کے اندر جانے کی کوشش کی لیکن وہاں پر موجود عملہ، یہ کہہ کر روک دیتا۔

''نہ چھوٹے ڈپٹی صاحب۔۔۔ وہاں نہیں جانا۔۔۔ اس کے اندر سانپ ہیں۔''

ہر انکار کے بعد، ان کی اسراریت کچھ اور بڑھ جاتی۔

○○○

ریاضت

گھر میں کبھی کافی نہیں تھا، لیکن بہت کچھ تھا۔ کبھی، تنگ دستی کا احساس نہیں ہوا۔۔۔ ابا جی جس پوسٹ پر تھے، وہاں رہ کر وہ جو کچھ بنا سکتے تھے، وہ ان کے ساتھ کے لوگوں کے گھروں میں نظر آتا تھا۔ ہمارے گھر میں نہیں۔۔۔ لیکن اس سے احساسِ کمتری کا تو سوال ہی کیا، جو احساسِ تفاخر ان دنوں میں تھا وہ آج دو چند ہو گیا ہے۔ خود ماں بنی تو پتہ چلا کہ والدین کیسے بچّوں کے لیے تارے توڑ لانا چاہتے ہیں؟۔۔۔ اور پھر 'مواقع' بھی میسر ہوں تو اس ریاضت کو کیا نام دیں؟ روزے اور فاقے میں بہت فرق ہے، فاقہ تو وہ کہ کھانے کو کچھ ہے ہی نہیں اور روزہ وہ کہ خوان سجے ہوں اور کھانا تو در کنار چکھنا بھی، جائز خیال نہ کیا جائے۔ (1)

امی ابا جی تا عمر روزے سے رہے۔

ooo

(1) [illegible]

'انوکھی لاڈلی'

امی بتاتیں کہ میں بہت چھوٹی تھی (شاید دو یا تین سال کی) تو ایک رات بہت ضد کی کہ مجھے چاند لینا ہے۔ سردیوں کی رات تھی اور میں "چندا لینا ہے، چندا لینا ہے۔" کی تکرار کیے جا رہی تھی گویا

ع انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند رے۔۔۔

مجھے بہلانے کے لیے صحن میں پانی کا ٹب رکھ کر اس میں چاند کا عکس دِکھایا گیا۔ ابا جی نے اسے 'شیشے میں اُتارا' لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ مجھے نہ ماننا تھا، نہ مانی بالآخر بات ڈانٹ پر ختم ہوئی۔

یہ بات سن کر چھوٹے بھائی لقمہ دیتے،

"اچھا۔۔۔آ۔۔۔آ۔۔۔تو یہ بچپن ہی سے بے وقوف ہے۔"

تو میں اس قصّے کو چھوڑ کر بھائی کے پیچھے پڑ جاتی۔

ایک بار، اسی طرح اصرار کرتی رہی کہ توے پر آدھی روٹی پکائی جائے امّی نے مجھ سے چھپا کر پکی ہوئی روٹی کے دو ٹکڑے کیے اور ایک حصّے کو توے پر ڈال کر مجھے دِکھایا لیکن

میں سمجھ گئی۔ پھر پیڑے کو لمبا لمبا بنا کر توے پر ڈالا، اس پر بھی میری تسلی نہ ہوئی۔ پھر توے پر ہی درمیان سے کاٹا لیکن میں اب پھر نہ مانی۔

اس پر چھوٹے بھائی کہتے:

''لہٰذا پھر ڈانٹ کھائی۔۔۔ یہ ہے ہی بے وقوف۔''

ooo

باوا آدم کی ہم عُمر

مَیں نے بہت چھوٹی عمر میں بولنا سیکھا اور بے تحاشہ باتیں کرتی تھی۔ گھر بھر کی بھرپور توجہ ملی، اس لیے گفتگو کا انداز بھی خاصہ عاقلانہ تھا۔ امّی نے مجھے ایسے ہی باتیں کرتے سن کر ایک بار کہا:

''یہ کون سی بچّی ہے۔ باوا آدم کی ہم عمر ہے۔''

میں نے جھٹ سے کہا:

''نہیں۔۔۔ میں ان سے گیارہ سال چھوٹی ہوں۔''

امّی یہ بات بڑے مزے سے دُہراتیں۔

ایک بار امّی، آپا اور بڑے بھائی جان پاکستان بننے سے پہلے کا کچھ ذکر کر رہے تھے میں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

''ہاں۔۔۔ ہاں بالکل ایسے ہی تھا، میں نے بھی دیکھا تھا۔''

چھوٹے بھائی نے کہا:

''تمہیں کیا پتا؟۔۔۔ تم تو تب پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔''

یہ بات میرے دل کو لگ گئی اور میں نے رونا شروع کر دیا۔

''اگر کوئی پیدا نہ ہوا ہو تو کیا وہ کچھ دیکھتا بھی نہیں ہے۔''

چھوٹے بھائی بعد میں اس بات کو دہرا کر مجھے چڑاتے۔

000

اُداس بُلبُل

میرے تینوں بڑے بہن بھائی، ہاسٹلز میں تھے۔ میں اور چھوٹے بھائی، امّی ابا جی کے پاس گھر پر ہوتے۔ اوپر تلے ہونے کے ناتے، ہم دونوں میں پیار بھی بہت تھا اور چخ بھی بہت چلتی تھی۔ جب ہم دونوں گھر پر ہوتے تو بہت شور مچتا اور اگر ایک گھر میں نہ ہوتا تو دوسرا اداس بلبل بنا کسی کونے میں پڑا رہتا۔

بچوں کے رسالے، باقاعدگی سے گھر پر آتے۔ 'کھلونا' ڈاکیا دے کر جاتا 'تعلیم و تربیت' اور 'بچوں کی دنیا' ہاکر، لا کر دیتا۔ جس روز، رسالہ متوقع ہوتا، میں اور بھائی سارا وقت گیٹ کے پاس گزارتے کہ پہلے رسالہ، لے لیں۔ اگر رسالہ، بھائی کے ہاتھ آجاتا تو میں بہت شور مچاتی اور اگر میرے ہاتھ آتا تو بھائی تڑپتے پھرتے۔ آخر کار یہ طے پاتا کہ باری باری، ایک ایک کہانی پڑھیں گے۔ ٹاس سے فیصلہ ہوتا کہ پہلے کون پڑھے گا۔ اِدھر بھائی پڑھنا شروع ہوتے اور اِدھر میں کہنا شروع ہو جاتی۔

''بھائی۔۔۔جلدی کریں۔۔۔جلدی کریں نا۔۔۔جلدی کریں۔''

پانچ منٹ میں پچاس بار سننے کے بعد بھائی زچ ہو کر چلا اُٹھتے:

''امّی۔۔۔اسے منع کریں۔''

اور جب میں پڑھتی تو بھائی منہ سے کچھ نہ بولتے۔بس تھپڑ مارنے کے انداز میں ہاتھ، میرے منہ کے پاس رکھے رہتے اور اس کا اتنا نفسیاتی اثر مجھ پر ہوتا کہ میں چلّانے لگتی۔

''امّی۔۔۔بھائی کو منع کریں۔۔۔مجھے مار رہے ہیں۔''

میں ایسے ڈکراتی کہ امّی بھاگی ہوئی آتیں۔

''بیٹا۔۔۔بہن کو کیوں مار رہے ہو؟''

اور جب صحیح صورتِ حال کا علم امّی کو ہوتا تو وہ کہتیں:

''کیوں خوامخواہ میں فضیحتہ کرتی ہو؟''

اور میں چلّاتی:

''امّی آپ بھائی کی طرف داری کر رہی ہیں۔''

ایسی صورت حال میں کوئی اور ماں ہوتی تو دونوں کی ٹھکائی کرتی لیکن میری امّی ہنستے ہنستے گلابی پڑ جاتیں۔۔۔آنکھوں میں آنسو آجاتے اور وہ سیز فائر کروا کے اپنے کام پر واپس چلی جاتیں۔

ooo

کُو۔۔۔کُو۔۔۔

کُو۔۔۔کُو۔۔۔ہم ریل گاڑی کی طرح بھاگتے۔بھائی آگے اور میں پیچھے۔۔۔ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے۔گاڑی آرام سے جا رہی ہوتی کہ انجن اچانک رک جاتا۔میری ناک، زور سے بھائی کی پُشت سے ٹکراتی، آنکھوں میں آنسو آجاتے، سر میں تارے ناچنے لگتے۔انجن اور ڈبّے کے تعلقات کشیدہ ہو جاتے لیکن اگلے روز گاڑی پھر اپنے مقررہ وقت پر رواں دواں ہوتی۔

ooo

'مواقع'

بڑے بھائی جان اور ڈاکٹر بھائی نہر پر سوئمنگ کے لیے جاتے تو مجھے اور چھوٹے بھائی کو بھی ساتھ لے جاتے۔ میں بہت چھوٹی سی تھی اور نہر کے کنارے بیٹھی گھاس توڑ توڑ کر اس میں ڈالتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد، خود بھی ساتھ ہی جا گری۔ ''غڑاپ'' کی آواز سن کر بھائی جان نے میری تلاش شروع کی۔ اتفاق سے میرا پاؤں ان کے ہاتھ میں آ گیا۔ دوسری بار میں تین چار سال کی رہی ہوں گی۔ ڈاکٹر بھائی مجھے کندھوں پر بیٹھا کر سوئمنگ کر رہے تھے کہ مَیں پانی میں جا گری۔ بہر حال جلد ہی 'دستیاب' ہو گئی۔ امّی کبھی اس کا ذکر کرتیں اور شکر کرتیں تو چھوٹے بھائی، مسمسی شکل بنا کر کہتے۔

''بس۔۔۔ قدرت کے سامنے کس کا زور چلا ہے؟۔۔۔ ورنہ 'مواقع' تو اچھے خاصے تھے۔''

ooo

قسمت پُڑی

امّی ہر مہینے کے شروع میں، مجھے اور چھوٹے بھائی کو الگ الگ، مٹی کی گولک منگوا کر دیتیں۔ ہمیں روزانہ دو، دو آنے جیب خرچ کے ملتے۔ اس زمانے میں Eating Out کا رواج نہیں تھا۔ جو تھوڑا بہت تھا، ابا جی اس کے بھی خلاف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ گھر پر سب مل بیٹھ کر کھائیں (اسی وجہ سے آج تک، صرف اپنے لیے کسی چیز کا تصوّر ہم بہن بھائیوں میں نہیں رہا اور کوئی ایسی چیز جو صرف اپنے پاس ہے اور بہن بھائیوں کے پاس نہیں ہے بستر میں چھپے کنکر کی طرح چبھتی ہے) میں بچپن میں اکثر بیمار رہا کرتی تھی، اس وجہ سے سکول میں الٹ پلٹ کھانے کی اجازت نہ تھی۔ امّی گھر سے ناشتہ بنا کر بھیجتیں اس لیے میں وہ دو آنے، بہت سینت سینت کر گولک میں ڈالتی۔

کبھی کبھار مہینے کے درمیان میں، بھائی مجھے ورغلا کر، گولک میں سوئیٹر بننے کی سلائی چلاتے اور جو پیسے نکلتے اس سے ہم 'قسمت پڑی' نکالتے یا پان کھاتے۔ ہم دونوں کو ہی پان بہت پسند تھے۔ بھائی تو کھاتے بھی اس طرح تھے کہ ان کے دونوں ہونٹ رنگ جاتے اور ہر بار وہ امّی سے کہتے:

"آپ ایک پاندان کیوں نہیں لے لیتیں؟"

امی بھائی کو، کوئی چھوٹی موٹی چیز لینے بھیجتیں تو وہ باقی پیسے اپنی گولک میں ڈال لیتے اور مہینے کے آخر میں، جب وہ بڑے اہتمام سے دونوں گولکیں توڑتے تو ظاہر ہے میں اپنی گولک میں تھوڑے پیسے دیکھ کر چلّانے لگتی۔ اُوپر سے بھائی ڈانٹتے۔

"پتا نہیں تم کیا کرتی ہو؟ دیکھو میری گولک سے کتنے پیسے نکلے ہیں۔"

پھر ہم ان پیسوں کی ڈھیریاں بناتے، بار بار گنتے اور خوش ہوتے (وہ خوشی، آج نوٹوں کی گڈیوں کو ہاتھ میں لینے سے بھی نہیں ملتی۔)

ooo

مجھے ابھی تک شبہ ہے

ایک دفعہ بھائی کی طبیعت 'شاید' ناساز تھی (مجھے ابھی تک شبہ ہے) وہ صبح صبح بستر میں، تھرمامیٹر لگائے بیٹھے تھے۔ میں سمجھی، سکول کے لیے بہانہ کر رہے ہیں۔ اب یہ تو مجھے گوارا نہ تھا کہ وہ چُھٹی کریں اور میں سکول جاؤں، اس لیے میں ان کے سر پر جا کھڑی ہوئی۔

"اب اسے منہ سے نکالیں بھی۔۔۔ اتنی دیر منہ میں لگائے رکھیں گے تو بخار چڑھ ہی جائے گا۔۔۔ نکالیں اسے باہر۔۔۔ نکالیں نا۔"

بھائی چیخے۔

"تمہارا کیا خیال ہے دیر تک تھرمامیٹر لگانے سے بخار آ جاتا ہے؟۔۔۔ پاگل۔"

اور میں واقعی پاگل ہوئی جا رہی تھی کہ دیر تک تھرمامیٹر لگانے سے لازمی طور پر بخار نظر آ جائے گا۔۔۔ بھائی چُھٹی کریں گے۔۔۔ اور میں۔۔۔

ooo

رات گہری ہو جاتی

۲۳ مارچ اور ۱۴ اگست کو چراغاں کرنے کے لیے، گورنمنٹ کی طرف سے سرسوں کا تیل، روئی کا بنڈل اور موم بتیاں گھر پر آتیں۔ میں اور بھائی یوں پُر جوش انداز میں، برآمدوں میں پھرتے جیسے چراغاں کی ساری ذمہ داری ہمارے نازک کندھوں پر ہی تو آن پڑی ہے۔ اردلی چاچا کی مدد سے روئی کی بتیاں بنائی جاتیں۔ میں اور بھائی، سارا سامان چھت پر منتقل کرتے۔ پانی کا جگ اور گلاس اُوپر لے جایا جاتا کہ کہیں اچانک پیاس لگ جائے تو کام میں خلل اندازی نہ ہو۔ یہ الگ بات کہ شام سے رات تک بیسیوں چکر اُوپر سے نیچے کے لگائے جاتے۔ دھڑ۔۔۔ دھڑ۔۔۔ دھڑ کچن کی ساری چوکیاں اوپر لے جائی جاتیں تا کہ جس سائز کی اونچائی درکار ہو، آسانی سے بنائی جا سکے۔ امّی اکڑوں بیٹھ کر کھانا بناتیں لیکن کبھی منع نہ کرتیں۔

ہوا کمبخت کو بھی اسی روز چلنا ہوتا۔ ایک طرف کے دیے جلاتے تو دوسری طرف کے بجھ جاتے۔ بھائی آستین سے فرضی پسینہ پونچھتے، اِدھر اُدھر آتے جاتے اور میں ان کے پیچھے پیچھے۔

امّی ابا جی کو صحن سے نظارہ کروایا جاتا۔ سبھی بہت خوش ہوتے۔ یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں آج کے بچے سمیٹنا نہیں جانتے۔

رات گہری ہو جاتی۔۔۔ موم بتّیاں ختم ہو جاتیں۔۔۔ اِکّا دُکّا دیا جل رہا ہوتا۔ امّی کے اصرار پر ہم نیچے آتے اور سو جاتے۔

صبح صبح، ہم پھر چھت پر ہوتے۔ تا کہ جلی ہوئی موم بتیوں کے موم کو پگھلنے سے پہلے 'محفوظ' کر لیا جائے۔ سارا موم، چاقو سے کُھرچ کُھرچ کر کسی برتن میں جمع کیا جاتا، پھر ہم تین اینٹوں کا چولھا بناتے اور اس کے نیچے پُرانی کاپیوں کے کاغذ جلا کر موم پگھلایا جاتا۔ بڑے اہتمام سے ہاتھ جلائے جاتے۔ امّی سے چھپایا جاتا۔ پتہ نہیں اس موم کو پگھلا کر ہم کیا بنانا چاہتے تھے؟

ooo

''اللہ دی سپرد''

جب میں بہت چھوٹی تھی تو ابّا جی کے پاس ایک سیکنڈ ہینڈ Norton موٹر سائیکل تھی، صبح جب ابّا جی دفتر جانے لگتے تو میں انہیں خدا حافظ کہہ کر، جلدی سے اندر بھاگ آتی اور جالی کے دروازے سے لگی باہر دیکھتی رہتی، کیونکہ موٹر سائیکل کی آواز بہت خوفناک تھی۔ اس کی گڑگڑاہٹ سے اردگرد کی زمین اور خوف سے میں تھرّانے لگتی۔ لیکن کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں نے ابّا جی کو خدا حافظ نہ کہا ہو۔ میری امّی بھی ہمیشہ گھر کے دروازے تک، انھیں خدا حافظ کہنے جاتیں اور باآوازِ بلند ''اللہ دی سپرد'' کہتیں اور جب ابّا جی کے آنے کا وقت ہوتا تو وہ خود دروازہ کھولتیں۔ ابّا جی کہتے،

''آپ کی امّی کی سماعت بہت اچھی ہے۔ میری موٹر سائیکل، دفتر سے روانہ ہوتی ہے تو انہیں معلوم ہو جاتا ہے۔''

ooo

''بیٹی کا خط مِلا''

ابّا جی ملتان سے خانیوال ٹرانسفر ہو گئے لیکن امّی اور ہم، بھائی لوگوں کے امتحانوں تک ملتان ہی میں رہے۔ میں نے ابھی سکول جانا شروع نہیں کیا تھا۔ سرکاری ڈاک کے ساتھ ابّا جی کا خط روزانہ آتا اور جواب بھی اسی طرح روزانہ واپس جاتا۔ میں اس خط کے ایک کونے میں ٹیڑھی میڑھی لکیریں ڈال دیتی۔ میری دانست میں، یہ میرا خط ہوتا۔ مزے کی بات یہ کہ ابّا جی بھی جواب میں لکھتے:

''بیٹی کا خط مِلا۔''

اور میں پھولی نہ سماتی۔

گرمیوں میں میری آنکھیں آ گئیں۔ ابّا جی میرے لیے ڈاک کے استعمال شدہ سبز رنگ کے ٹکٹ بھیجتے کہ سبز رنگ کو دیکھنے سے آنکھوں میں طراوت آتی ہے۔ ان کا فائدہ تب تو کیا ہونا تھا لیکن آج ان کی ٹھنڈک میں اپنی آنکھوں میں محسوس کر سکتی ہوں۔

جب روکھے پھیکے لوگوں کو دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں، شاید حسّاس لوگ محبت کرتے ہیں۔ یا شاید محبت کرنے والے حسّاس ہو جاتے ہیں۔ میں بہت حسّاس ہوں۔

ooo

کہانیوں کی کتاب

جب پڑھنا سیکھا تو ترغیب دلانے کے لیے مجھ سے کہا گیا کہ کہانیوں کی ایک کتاب ختم کرلو گی تو دوسری دِلا دی جائے گی۔ ان دنوں 'کھلونا دہلی' والے، بچّوں کے لیے بڑی خوبصورت کتابیں چھاپتے تھے۔ ان کی قیمت چھ آنے ہوتی تھی۔ میں اردلی چاچا کے ساتھ، سائیکل پر بیٹھ کر کتاب لینے چلی جاتی۔ واپسی پر، سائیکل پر بیٹھے بیٹھے، کتاب ختم کر لیتی اور گھر پہنچ کر اگلی کتاب کا مطالبہ شروع کر دیتی۔

ooo

ع اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے

میں نے بہت چھوٹی عمر میں لکھنا سیکھ لیا تھا۔ جس روانی سے گفتگو کرتی، اسی سے لکھتی بھی تھی۔ آپا ہاسٹل میں تھیں۔ میرا دل بہت اُداس تھا۔ میں نے آپا کو خط لکھا۔۔۔ اور تو جو لکھا سو لکھا، ایک عدد شعر بھی لکھ دیا۔ نہ جانے میں نے کہاں سے سُنا تھا؟ شاید گانا تھا!

ے اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے
کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

(تب میں بمشکل پانچ سال کی رہی ہوں گی)

آپا نے ہاسٹل میں رو رو کر بُرا حال کر لیا اور ویک اینڈ سے پہلے ہی چھٹی لے کر گھر چلی آئیں۔

ooo

’موٹی موٹر‘

بچپن میں شام کے وقت میونسپل کمیٹی کی گاڑی چھڑکاؤ کے لیے آتی (جی! تب ایسا بھی ہوتا تھا) میں اسے ’موٹی موٹر‘ کہتی۔ چھوٹے بھائی بہت گولو مولو سے تھے، میں نے ان کا بھی یہی نام رکھ دیا (انہیں علم نہیں تھا)۔ وہ آتے تو میں کہتی،

’’امّی، موٹی موٹر آئی ہے۔‘‘

وہ باہر جھانکتے لیکن ظاہر ہے گاڑی وہاں نہ ہوتی۔ دو چار دن ایسا ہوتا رہا۔ وہ بڑبڑاتے:

’’کہاں ہے گاڑی؟۔۔۔ اس کا تو دماغ خراب ہے۔‘‘

کافی دنوں کے بعد، جب انہیں معلوم ہوا تو دانت کچکچاتے ہوئے میرے پیچھے بھاگے۔

OOO

ڈھونڈ لو

میں اور چھوٹے بھائی ’لکن میٹی‘ (آنکھ مچولی) کھیلتے۔ ایک چھپتا، دوسرا ڈھونڈتا۔ چھپنے والا زور سے آواز لگاتا ’’ڈھونڈ لو۔۔۔‘‘

بھائی تو آرام سے چھپے رہتے اور میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو جاتی۔ جب میری باری آتی تو میری ’’کھی کھی۔۔۔ کھی کھی‘‘ مجھے پکڑوا دیتی۔ میں اُلٹا بھائی سے لڑتی۔

’’مجھے اتنی جلدی کیوں ڈھونڈا؟۔۔۔ ابھی کچھ دیر اور لگانا تھی‘‘

بھائی کے اس دنیا سے جانے کے بعد مجھے لگتا ہے، ابھی آواز آئے گی۔

’’ڈھونڈ لو۔۔۔‘‘

OOO

قاتل یادیں

چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتے رہتے میں بالکل ٹام بوائے بن گئی۔ درختوں پر چڑھنا۔۔۔چھتیں پھاندنا۔۔۔گھونسلوں سے چڑیا کے بچے پکڑنا۔۔۔اور کیا نہیں۔

اس سے، میری شخصیت سے نام نہاد 'نسوانیت' کا عنصر خارج ہو کر رہ گیا۔ موٹر سائیکل اور کار چلانا، بلا جھجک گفتگو کرنا، اکیلے سفر کرنا اور کو ایجوکیشن میں پڑھنا میرے لیے مسئلہ نہ بنا۔

میرا خیال ہے صرف ایک موقعہ ایسا تھا، جب ہم دونوں ساتھ ہوتے اور مکمل خاموشی ہوتی۔۔۔رات کو ریڈیو پر کہانی سنتے وقت۔ ہم باقاعدگی سے، وہی بار بار دہرائی جانے والی کہانیاں سنتے۔ موہنی حمید کی آواز اب بھی میرے کانوں میں رَس گھولتی ہے۔

سنا ہے اب بھی شام کے وقت ریڈیو پر کہانی سنائی جاتی ہے۔ ایک دن میں نے سوچا سنوں، آج کل کیسی ہوتی ہے؟ لیکن پھر سوچا اوّل تو کہانی وہ رنگ نہیں جمائے گی اور اگر ہو بھی تو بھائی کو کہاں سے لاؤں گی؟

یہ قاتل یادیں انسان کو ریزہ ریزہ کر کے ختم کرتی ہیں۔

OOO

بچا کھچا میٹریل اور اُونٹ کا غبارہ

چھوٹے بھائی، مجھ سے چھ سال بڑے تھے۔ اتنے سال کے وقفہ کے بعد بہن بھائیوں کو میں کیا ملی، گویا کھلونا مل گیا۔ سارا وقت میں ان کی گود میں کھیلتی۔ امّی بتاتیں کہ بڑے بھائی جان مجھے گود میں اٹھاتے، اچھالتے، جھلاتے اور کہتے:

''اتنی ہی رہنا۔۔۔بڑی نہ ہونا۔''

بچپن میں مَیں خاصی نرم و نازک سی چیز تھی (اگرچہ اب یہ بات سراسر جھوٹ لگتی ہے) بھائی جان میرے ہاتھوں، بازوؤں کے جوڑ ہلاتے اور کہتے:

''اسے ایسا ہی ہونا تھا۔۔۔بچے کھچے میٹریل سے جو بنی ہے۔''

ایک بار ہم لوگ اپنے ددھیالی عزیزوں کے ہاں حاصل پور گئے۔ بڑے بھائی جان کہیں سے ایک اونٹ لے آئے اور مجھے کہنے لگے آؤ تمہیں سیر کراؤں۔

انہوں نے مجھے اونٹ پر بٹھایا اور خود ساتھ چل کر پورے گاؤں کا چکّر لگوایا۔ بہت مزہ آرہا تھا کہ اچانک اونٹ نے زبان باہر نکال کر بلبلانا شروع کر دیا۔ میں مارے گھبراہٹ کے چیخنے لگی۔ بڑے بھائی جان کہنے لگے۔

''کچھ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ اونٹ میلے میں گیا تھا۔ وہاں سے غبارہ لایا ہے اور اب اسے پُھلانے کی کوشش کر رہا ہے۔''

مجھ کو شکوہ ہے میرے بھائی۔۔۔

میں اور چھوٹے بھائی ساتھ ساتھ سائیکل چلاتے، پتنگ اڑاتے، پٹھو گرم، گلّی ڈنڈا اور کرکٹ کھیلتے۔ ابا جی سیالکوٹ گئے تو میرے اور بھائی، دونوں کے لیے کرکٹ کے بیٹ، پیڈ اور دیگر سامان لے کر آئے۔ آپا نے ہم دونوں کو سویٹر بن کر دیے جو کرکٹرز کے لیے مخصوص تھے۔ آف وائیٹ سویٹر۔۔۔ وِی گلا اور اس پر دو رنگ کی پٹی۔

میں محلّے بھر میں سائیکل چلاتی پھرتی، لیکن اگر بازار سے کوئی چیز لانا ہوتی (جو یقیناً سکول سے متعلّقہ ہوتی) تو مجھے بھائی کی منتّیں کرنا پڑتیں۔ کافی کوشش کے بعد وہ مان جاتے تو ایک اور شرط راستہ روکے کھڑی ہوتی۔

''جاؤ۔۔۔ پہلے 'گوڈے'، ڈھک کر آؤ۔''

میں کافی دیر تک فراک پہنتی رہی تھی۔ اس پر اگر کسی کو اعتراض ہوتا تو چھوٹے بھائی کو، وہ بھی بازار جاتے وقت۔ پھر مجھے وہ شلوار پہننا پڑتی جو میں مولوی صاحب سے قرآن پاک پڑھتے وقت پہنتی تھی۔ میں آگے بیٹھتی۔ بھائی سائیکل چلاتے۔ ساتھ ساتھ ہم باتیں کرتے جاتے۔۔۔ اُف۔۔۔ اُف۔۔۔

؎ مجھ کو شکوہ ہے میرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے
لے گئے ساتھ مِری عمرِ گزشتہ کی کتاب
اس میں تو میری بہت قیمتی تصویریں تھیں
اس میں بچپن تھا مرا، اور میرا عہدِ شباب (فیض)

ooo

یارات

تاروں کی برات

رات کو امّی روٹی پکا چکتیں تو میں ان سے فرمائش کرتی وہ دہکتے ہوئے کوئلے سے، گرم توے کو اُلٹی طرف سے چھو دیتیں۔ ان جلا کاربن، جلنے لگتا۔ ایسی روشنی والی، تاروں کی برات، توے کے ایک سرے سے دوسرے سرے کی طرف چلتی کہ اس کی جگمگاہٹ اگلے روز تک میرے ذہن میں محفوظ رہتی۔۔۔ اور شاید اب تک ہے۔

ooo

قسمیں وعدے

میرے بچپن میں، ابّا جی دورے پر جاتے تو کبھی کبھار، مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ میں بہت سے رسالے ساتھ لے جاتی۔ امّی کھانا ساتھ دے دیتیں۔ ہم ریسٹ ہاؤس میں سارا دن گزارتے۔ کھلے علاقے میں، ریسٹ ہاؤس کی فضا ایک خاص انداز لیے ہوتی۔ محراب دار دروازوں والے برآمدے، اُونچی اُونچی چھتوں والے ڈھنڈار کمرے، پختہ سیڑھیوں سے میں بیسیوں بار چھت پر چڑھتی۔ دور دور تک پھیلے ہوئے درختوں کی ٹھنڈک دل میں اُتر جاتی۔ ان کے پتّے کھڑ تالیں بجاتے، کوئل اور فاختہ کی آواز آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ زمین پر دانہ چگتی چڑیاں، اچانک پھرّا مار کر اُڑتیں اور لہرا کر کسی درخت پر جا بیٹھتیں۔ اردگرد پھیلا ہوا سکون اور فضا میں منجمد خوشی مجھے نہال کر دیتی۔ اب بھی سفر کے دوران کوئی ریسٹ ہاؤس نظر آ جائے تو میں اسی کیفیّت میں ڈوب جاتی ہوں۔

ابّا جی کام میں مصروف رہتے۔ گاہے گاہے مجھے پچھوا لیتے۔ واپسی میں، اکثر شام ہو جاتی۔ کسی نہر کی سروس روڈ پر جیپ کی روشنی میں سرکنڈے چاندی کی طرح چمکتے، نہر کے اُوپر دُھندسی چھائی رہتی۔ پانی کے بہنے کی آواز، رات کی خاموشی میں عجب اسراریت لیے

ہوتی، کبھی کبھار سڑک پر جنگلی خرگوش یا گیدڑ بھاگتا ہوا نظر آتا۔ اس کی آنکھیں رنگین قمقموں کی طرح چمکتیں۔ یہ سب مجھے بہت اچھا لگتا۔ لیکن اگر کبھی راستے میں دریا کے پُل پر سے گزرنا پڑتا تو یہ کبھی بھی اچھا تجربہ نہ ہوتا۔ اندھیرے میں تیز پانی بہنے کی آواز، مجھے خوف زدہ کر دیتی۔ مجھے لگتا اب کی بار تو جیپ ضرور ہی پانی میں گرے گی۔ سارے دن کی پکنک کا مزہ غارت ہو جاتا اور میں تہیہ کر لیتی کہ آئندہ ابا جی کے ساتھ نہیں آؤں گی۔ لیکن پُل پار کرتے ہی، میری قسمیں، وعدے، ریت کی دیوار ثابت ہوتے۔

ooo

سرخا سرخ۔۔۔ نارنجی۔۔۔ زعفرانی۔۔۔ یاقوتی

ہمارے گھر کا لان بہت بڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف حاشیے کی صورت میں، عمدہ قسم کا گلاب لگا ہوا تھا۔ رنگا رنگ، بڑے بڑے پھول ہمارے ساتھ تتلیوں کو بھی بہت پسند تھے۔ مختلف قسم کی تتلیاں ان پر منڈلاتی رہتیں۔ سُرخا سرخ۔۔۔ نارنجی۔۔۔ زعفرانی۔۔۔ یاقوتی میں اور چھوٹے بھائی ان کے پیچھے بھاگتے پھرتے۔ میں گھر سے امّی کا کوئی دوپٹہ لے آتی۔ ہم اسے ایک پودے پر پھیلا دیتے تو بہت سی تتلیاں اس کے نیچے قید ہو جاتیں۔ اس زمانے کی تتلیاں بھی شاید بھولی بھالی تھیں، ڈھیروں ہاتھ لگتیں۔ ہم تھوڑی دیر ان سے کھیلتے۔۔۔ پھر وہ سنہری رنگ ہمارے ہاتھوں پر چھوڑ کر اُڑ جاتیں۔ لیکن اس سب میں، امّی کا دوپٹہ برباد ہو جاتا۔ آپا ہاسٹل سے چھٹیوں میں گھر آئیں تو امّی نے انہیں بتایا، انہوں نے بیڈمنٹن کے پرانے ریکٹ پر، اپنے پرانے جالی کے دوپٹے کو اس طرح لگا دیا کہ وہ تتلیوں کو پکڑنے والا جال بن گیا یوں ہمیں بھی آسانی ہو گئی اور امّی کا دوپٹہ بھی بچ گیا۔

سول لائن کے علاقے میں بہت بڑا سا گھر۔۔۔لان، صحن، سبزہ، پھل دار پودے، پھول، بیر بہوٹیاں، تتلیاں اور جگنو۔۔۔میں اور چھوٹے بھائی جگنو پکڑتے اور انہیں صحن میں، اپنے بستر میں لگی مچھر دانی میں چھوڑ دیتے۔ یہ چھوٹی سی جگمگاتی ٹھنڈی روشنی، شہروں میں تو آج کل ناپید ہوگئی ہے۔ایک بار میں نے دن کی روشنی میں جگنو دیکھا تو اسے پہچان ہی نہ پائی۔ اس چھوٹے سے بھورے رنگ کے کیڑے کو دیکھ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی۔تب سے میرا ایمان ہے کہ جگنوؤں کو کبھی دن کی روشنی میں نہیں دیکھنا چاہیے۔

OOO

تخم ملنگاں

ایک بار چھوٹے بھائی نے میرے سر میں خشک تخم ملنگاں ڈال دیے اور پھر بڑے لاڈ سے کہنے لگے:

''میں نلکا چلاتا ہوں، چلو تم نہا لو۔۔۔''

میرے نہانے کی دیر تھی کہ بال پھول کر، جڑ گئے۔امّی بمشکل میرے بالوں میں کنگھی کرتی رہیں اور ہنستی رہیں۔ ہنستے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور وہ گلابی ہو جاتیں۔

OOO

ہفتہ بھر کی کریم

مجھے بچپن ہی سے چہرے پر کچھ لگانے سے چڑ ہے۔ شدید سردیوں میں چہرے کی نازک جلد پھٹ جاتی، پھر اس پر اگر کریم لگاتی تو اور مرچیں لگتیں۔ اس پر آپا بہت ناراض ہوتیں۔ ہفتہ کی شام کو جب انہیں ہاسٹل سے گھر آنا ہوتا تو میں ان کے آنے سے پہلے منہ دھو کر اتنی کریم تھوپ لیتی کہ دُور سے چمکتی نظر آتی۔ اسے دیکھ کر آپا بے ساختہ ہنستیں۔ انہیں اندازہ ہو جاتا کہ ہفتہ بھر کی کریم آج ہی بطورِ خاص لگائی گئی ہے۔ پھر وہ پیار سے سمجھاتیں کہ اگر یہی مقدار ہفتہ بھر بانٹ کر لگاتی رہو تو یہ نوبت نہ آئے۔

○○○

'تلخ' یاد

بچپن کی 'تلخ' یادوں میں سے ایک، ہفتہ وار کونین کی گولی نگلنا ہے۔ مچھر اس زمانے میں بھی بہت ہوتے تھے اور ان سے بچاؤ کے طریقے بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔۔۔ اس لیے ملیریا کا ہونا، ناگزیر تھا۔ ابا جی بڑی باقاعدگی سے سب کو اپنے سامنے پیلوڈرین کی گولی کھلاتے۔ ہفتہ کی دوپہر کو کھانے کی میز پر گولیوں کا ڈبہ، دیکھ کر بھوک اُڑ جاتی۔ دل دھک دھک کرنے لگتا۔ لیکن اس سے مفر نہیں تھا۔ گولی کمبخت کا سائز، بھی کافی بڑا ہوتا۔ دو گلاس پانی کے ساتھ گھل گھل کر کہیں وہ حلق سے نیچے اترتی، دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہتا۔

دوسرا طریقہ میٹھے چوسنے کا تھا۔ ابا جی بہت پیار کے ساتھ میٹھے کاٹ کر دیتے لیکن انہیں دیکھتے ہی، میرے حلق میں آنسوؤں کا پھندا لگ جاتا۔ ابا جی اس سے کونین کی دریافت اور اس کی افادیت سے آگاہ کرتے لیکن دل تھا کہ مان کر نہیں دیتا تھا۔

آج کل کمروں میں سونے کا رواج بڑھ گیا ہے تو مچھر دانی کلچر بھی ختم ہو گیا ہے۔ تب صحن میں بستر لگے ہوتے جن پر سرِ شام مچھر دانیاں لگا دی جاتیں۔ 'قطار اندر قطار' اور ان کے پردوں کو سمیٹ کر، ان کی چھت پر اکٹھا کر دیا جاتا۔ سونے کے وقت، پردے گرا دیے

جاتے۔تھوڑی دیر کے لیے گھٹن کا احساس ہوتا۔لیکن مچھر کے مقابلے میں یہ گوارا ہوتا۔اس میں سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی، چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑوں میں بٹی ہوتی۔اسے دیکھتے دیکھتے، نیند آجاتی۔سردیوں کے شروع میں جیسے رضائیوں کو سنوارا جاتا، اسی طرح گرمیوں کے شروع میں مچّھر دانیوں کی تعداد، مرمّت، دھلائی اور ان کے لیے لاٹھیوں کا سٹاک، چیک کیا جاتا۔

ooo

ابابیل

راجہ دھیان سنگھ کی حویلی والے گھر میں ابابیلیں بہت ہوتی تھیں۔کبھی جو کوئی ابابیل کمرے کے اندر آجاتی تو میں اور بھائی دروازے بند کر کے اس کو پکڑنے کی کوشش کرتے۔ کپڑا لہرا لہرا کر اسے مسلسل اُڑتے رہنے پر مجبور کیا جاتا۔آخر کار وہ تھک ہار کر، بے دم ہو کر گر جاتی۔ہم اسے پکڑ لیتے۔اس کے گرم جسم میں چھوٹا سا دل، بے طرح دھڑک رہا ہوتا۔وہ میرے ہاتھوں میں پھڑ پھڑاتی تو میں اس کی نوکیلی چونچ اور پنجوں سے خائف ہو کر اسے چھوڑ دیتی۔ بھائی اسے پھر سے پکڑ کر، میرے ہاتھوں میں دے دیتے۔کافی دیر یہ سلسلہ جاری رہتا۔جب کافی کھیل چکتے تو بکمال مہربانی 'رحمدلی' کے جذبے سے سرشار ہو کر اسے چھوڑ دیا جاتا۔

ooo

آفیسر کلاس وَن

شام کو ابا جی کے منشی جی، گھر پر آتے۔ ان کے آنے سے پہلے، اردلی چاچا باہر کے صحن میں چھڑکاؤ کر کے میز اور کرسیاں ڈال دیتے۔ منشی جی کاغذات کا پلندہ میز پر رکھ دیتے۔ وہ جہاں جہاں انگلی رکھتے۔۔۔ ابا جی دستخط کرتے جاتے۔ یہ سلسلہ کافی دیر چلتا رہتا۔ میں پاس بیٹھی دیکھتی رہتی۔ مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا اور میں سوچتی کبھی میں بھی ایسا کر سکوں گی؟۔۔۔ اور آج جب میں خود اس قابل ہوں تو میں نے کسی بھی تصدیق کروانے کے لیے آنے والے شخص کو منع نہیں کیا۔ اور جب کسی گزیٹیڈ افسر کا ذکر ہوتا تو ابا جی کہتے،

''بیٹا۔۔۔ گزیٹیڈ کلاس وَن آفیسر ہونا کوئی چھوٹی بات ہے۔''

اور آج جب میں ہوں، تو ابا جی نہیں ہیں۔ میں نے سروس ان کے جانے کے بعد شروع کی۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو کتنا خوش ہوتے، مجھے اس کا بخوبی اندازہ ہے۔

ooo

ریت کے محل

میں نے بچپن میں بہت سے Pet پال رکھے تھے۔ مانو کے لیے، آپا نے بہت خوبصورت کشن بنا کر دیا تھا۔ دن میں تو وہ اس پر استراحت فرماتی لیکن رات میں میرے بستر میں، پاؤں سے لگ کر سوتی۔ صبح اُٹھتے ہی میری پہلی ملاقات اس سے ہوتی۔ پھر میں بستر سے نکل کر میاں مٹھو کا حال دریافت کرتی۔ کتّے سے معانقہ کرتی۔۔۔ چڑیوں کے پنجرے۔۔۔ خرگوش۔۔۔ ہرن۔۔۔ ان دنوں ٹی وی تو تھا نہیں۔ بچوں کا دل بہلانے اور وقت گزارنے کے لیے ایسی مصروفیات ضروری تھیں۔ میں اور چھوٹے بھائی کتّے کی ٹریننگ کرتے۔ وہ ہاتھ ملاتا۔۔۔ گیند پکڑ کر لاتا۔۔۔ کہنے پر اُٹھتا بیٹھتا۔۔۔ آتا جاتا۔ پچھلے پاؤں پر کھڑا ہو کر معافی مانگتا۔ میاں مٹھو سلام کرتا، چُوری کھانے پُر اصرار کرتا تو کرتا چلا جاتا۔ امّی کہتیں:

''بچّو! اسے یہ بھی سکھاؤ کہ جب کھا چکے تو تکرار چھوڑ دے۔''

امّی، ابا جی دونوں، ہمارے اس شوق میں شریک ہوتے۔ ابا جی پوچھنے پاچھنے کی حد تک۔۔۔ اور امّی با قاعدہ عملی طور پر۔۔۔ بلّی کو دودھ ڈالتیں۔۔۔ چڑیوں کو باجرہ ڈالتیں

اور مٹھو کے لیے چوری بناتیں۔ ابا جی اسے پھل کا ٹکڑا ڈالتے اور کہتے:

"یہ پھلوں پر پلنے والا پرندہ ہے۔ اتنی صاف ستھری غذا کھاتا ہے لیکن حرام، اس لیے ہے کہ اس کی چونچ مڑی ہوئی ہے۔ ویسے تو اچھا ہی ہے ورنہ مسلمان، اس خوبصورت پرندے کو بھی چٹ کر جاتے۔"

پھر وہ ہمیں بتاتے کہ تقسیم سے پہلے ہندوؤں کے دیہات میں مور عام پائے جاتے تھے۔ گھروں کی دیواروں پر بیٹھے رہتے۔ لیکن مسلمانوں کے گاؤں میں یہ نظر نہیں آتے تھے۔ یہ اُدھر کا رُخ ہی نہیں کرتے تھے اور اگر ایک آدھ بھولا بھٹکا اُدھر چلا جاتا تو پھر واپس نہ آتا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں، بہت ساری ریت صحن کے ایک کونے میں ڈلوا دی جاتی۔ جس میں ہم خوب کھیلتے، ریت کے محل تیار کرتے۔ اس کے باغیچے میں پھول اور پتے توڑ کر سجاتے۔ باورچی خانے سے گلاس اور پیالیاں لا کر ریت کو ان کے سانچے میں ڈھالا جاتا اور جب بھائی کی ٹھوکروں سے، سب چیزیں زمین بوس ہو جاتیں تو اس دن کا کھیل اختتام پذیر ہوتا۔

OOO

چاند پر قدم

اتوار کی صبح، میں اور بھائی 'خزانے' کی تلاش میں نکلتے۔ رنگ برنگے پر، خوبصورت پتھر، کانچ کی گولیاں۔۔۔ اور ایسی ہی بے مایہ چیزیں، جو ہمارے لیے انتہائی اہم تھیں۔ عمرو عیّار کی زنبیل جیسے تھیلے میں تمام چیزیں محفوظ تھیں۔ ہم انہیں فرش پر انڈیل دیتے، الگ الگ کرتے، ترتیب دیتے، پھر تھیلے میں بند کر کے اگلے اتوار تک کے لیے اٹھا رکھتے۔

کڑی دھوپ میں 'آتشیں شیشے' سے کاغذ جلانے کا مظاہرہ کیا جاتا۔ جب کاغذ سلگنے لگتا اور دھواں چھوڑتا تو میرے اور بھائی کے چہرے پر، ایسے تاثرات ہوتے جو چاند پر قدم رکھتے ہوئے، یقیناً نیل آرمسٹرانگ کے رہے ہوں گے۔

قیف میں ریت بھر کر، شیشے کی بوتل میں رکھا جاتا یہ ہماری دانست میں 'ریت گھڑی' تھی۔

مقناطیس سے سمت معلوم کرنا، بھی دلچسپ مشغلہ تھا۔ ہم گھر کے گیٹ میں داخل ہوتے اور اسی کی 'مدد' سے کمروں میں گھومتے گھامتے، باورچی خانے میں امّی کے پاس جا پہنچتے، فیوز بلب میں سوراخ کر کے، اس میں رنگ دار پانی بھرنے میں بھی بھائی کو مہارت حاصل

تھی اور میں ان کے اس 'فن' سے بہت متاثر تھی۔

بھائی کے ڈرائنگ کے ماسٹر صاحب کا انگوٹھا، کسی حادثے میں جاتا رہا تھا۔ وہ ان کی سہولت کی خاطر، ان کے کہنے پر بڑے سائز کی رنگین پینسلیں خریدتے۔ میرے پاس چھوٹے سائز کی پینسلیں ہوتیں اور میں سوچتی کہ کاش کوئی ایسا سلسلہ بن جائے جس سے میں بھی بڑی پینسلیں خرید سکوں۔

گلوب کے پیچھے لیمپ جلا کر دن رات کا نظارہ، موسموں کا آنا جانا، زمین کی محوری اور سورج کے گرد گردش کا دیکھنا ہمارا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

ٹوٹے ہوئے تھرمامیٹر کے پارے کے ساتھ کھیلنے میں بھی بہت مزہ آتا۔ وہ چمکدار گولی ہمارے ہاتھوں کی حرارت سے حرکت کرتی۔ ہم کبھی اسے اُنگلی سے پھوڑ کر، کئی حصّوں میں تقسیم کر دیتے۔ پھر انہیں یکجا کر کے فرش پر دوڑاتے پھرتے۔ کھیل کے اختتام پر اسے ڈبیا میں بند کرنا، کارے دارد ہوتا۔

OOO

جھُلنگا

صحن میں ڈالنے والی چارپائیاں، بان سے بنی جاتیں۔ جن کی وقتاً فوقتاً مرمت یا نئے سرے سے بنائی ضروری ہوتی۔ ایک بار، ایک چارپائی کو دوبارہ بنوایا جانا تھا لیکن میں نے امّی کو منع کر دیا کہ جب تک میں نہ کہوں، اسے ایسے ہی رہنے دیں۔

سکول سے واپسی پر، میں اُلٹے سیدھے دو نوالے لیتی اور کتابوں اور رسالوں کا ایک ڈھیر اٹھا کر اس میں گھس جاتی۔ بکائن کی گھنی چھاؤں تلے، میرا انداز کچھ یوں ہوتا کہ کمر تو زمین کو چھو رہی ہوتی اور پاؤں کا رُخ آسمان کی طرف ہوتا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی تو بکائن کے سفید اور کاسنی پھول گرتے رہتے۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ اور پتّوں کے درمیان روشنی کی بنت۔۔۔ میں گھنٹوں اسی جھلنگے میں گزار دیتی۔ کبھی باہر نکلتی اور املی، ٹافی یا بسکٹ لے کر پھر غڑاپ سے اسی پر جا براجتی۔ تین چار ہفتے تک جب میں نے اجازت 'مرحمت' نہ کی تو امّی کو مجبوراً زبردستی کرنا پڑی۔

OOO

پِچُّو

کبھی چھوٹے بھائی مجھے آواز دیتے۔ میں جہاں ہوتی وہیں سے کہتی۔

''کیا ہے بھائی؟''

''اِدھر آؤ۔''

''آپ بتائیں کیا بات ہے؟''

وہ زور دے کر کہتے:

''کہا نا۔۔۔اِدھر آؤ۔''

میں اپنی جگہ سے بمشکل دس انچ ہلتی۔

''ہاں بتائیں۔''

''نہیں، تم پاس آؤ۔''

میں پھر ایک قدم آگے آکر کہتی۔

''ہاں۔۔۔اب بتائیں کیا بات ہے؟''

نہ وہ باز آتے نہ میں۔

آدھ گھنٹے میں چار قدم کا فاصلہ طے کر کے، جب میں ان کی کرسی کو چھوتے ہوئے پوچھتی۔

''بتائیں نا۔۔۔کیا کہنا ہے؟''

تو وہ رسان سے کہتے:

''پانی پلادو۔''

بس، پھر کیا ہوتا؟۔۔۔میں ان کے گال نوچ لیتی۔ وہ آہستہ سے میرے بالوں کی ایک لٹ کھینچ دیتے اور مجھے پتنگے لگ جاتے۔ مجھے اس سے بہت چڑ آتی تھی۔ ایک بار میں حلق پھاڑ کر چیخی تو امّی آگئیں۔ ظاہر ہے بھائی کو ڈانٹ پڑی۔ بھائی نے اپنے بالوں کی لٹ، اس زور سے کھینچی کہ وہ جڑ سے اُکھڑ گئی۔

''کیا ہوتا ہے اس سے؟۔۔۔اس کی تو عادت ہے شور مچانا۔''

امّی کئی بار اس واقعے کو دہراتیں۔۔۔اور میں زور سے جھرجھری لیتی۔

بھائی کی میّت پر، امّی نے کہا:

''بیٹا۔۔۔بھائی سے پکّی لڑائی کر لی۔''

جب میں بہت چھوٹی تھی تو انہیں صفدر صاحب کہتی تھی۔ یاد نہیں کب سے بھائی جان کہنا شروع کیا، لیکن بھائی جان کہنے سے ان کے 'درجات' بلند نہ ہوئے، میں اب بھی انہیں چھیڑتی۔۔۔الٹ پلٹ نام دیتی۔ ایک دفعہ میں نے ان سے کہا۔

''ہیں کیا؟ پِچُّو سے''

یہ نام اتنا مقبول ہوا کہ وہ گھر بھر کے 'پِچُّو' بن گئے اور تب تک رہے جب تک ہم سے جدا نہ ہوگئے۔ ان کی اس 'حرکت' پر میرا دل چاہتا ہے حلق پھاڑ کر کہوں۔

''ہیں کیا؟ پِچُّو سے۔''

ooo

دیکھنا سرکس کا

شہر میں بہت اچھا روسی سرکس آیا تو ابا جی نے مجھے اور بھائی کو، اردلی چاچا کے ساتھ بھجوا دیا۔ اس کا دورانیہ کافی زیادہ تھا۔ میں نے تو، سوتے جاگتے دیکھا لیکن بھائی شاید اس کو اپنے اندر جذب کرتے رہے۔ اگلے روز 'وہ' باہر نکلنا شروع ہوا تو بھائی نے جو کود پھاند کی ہے۔۔۔ نتیجہ، اچھی خاصی چوٹ لگوالی۔ میں ان کی طرف دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اب وہ بے چارے اپنی جگہ سے ہلتے بھی تو میں چلاّتی،

''امی۔۔۔ بھاگ کر آیئے۔۔۔ بھائی پھر 'سرکس' کرنے لگے ہیں۔''

OOO

وقت کا دھارا

۱۹۵۸ء میں ابا جی قصور میں تھے۔ اس سال لاہور میں لگنے والی صنعتی نمائش دکھانے کے لیے، بڑے بھائی جان مجھے اور چھوٹے بھائی کو لے گئے۔ اس سال وہاں پر، پہلی بار ایک Close Circuit Television دکھایا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک جمِ غفیر تھا۔ لوگ ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ ٹی وی کو اونچائی پر رکھا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے دیکھنے میں دِقّت ہو رہی تھی۔ بڑے بھائی جان نے مجھے کندھوں پر اٹھا کر یہ منظر دکھایا۔ یہ سب ناقابلِ یقین لگ رہا تھا۔ واپس آ کر جب میں نے ابا جی کو بتایا تو وہ کہنے لگے،

''میں نے پہلی بار، ریڈیو کسی ہندو کے گھر میں دیکھا تھا اس نے بڑے سے کمرے کے ایک کونے میں، اسے رکھا ہوا تھا۔ کمرہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سب ایک دوسرے کے کندھوں کے اُوپر سے اُچک اُچک کر اسے دیکھ رہے تھے۔ مجھے یہ سب ناقابلِ یقین لگ رہا تھا۔''

وقت کا دھارا یونہی بہتا رہتا ہے۔

OOO

نور بانو

چھوٹے شہروں میں تفریح نام کی دو ہی چیزیں تھیں فلم اور میلہ۔ فلم تو خیر ہمارے لیے شجرِ ممنوعہ تھی، یوں تو میلے پر بھی کبھی نہیں جاتے تھے۔ ایک بار نہ جانے کیسے، بھائی کی فرمائش پر ابا جی نے مجھے اور بھائی کو اردلی چاچا کے ساتھ بھجوا دیا۔ وہاں سے کچھ کھانے پینے کی اجازت تو نہ ملی، بس گھوم گھام کر آ گئے۔

پہلے تو بارہا دیکھا ہوا، بندر کا تماشہ دیکھا۔ پھر بائیسکوپ دیکھنے لگے۔ میلے کپڑے میں منہ ڈال کر، پسینے میں شرابور۔۔۔ تمام تر توجہ خراشوں والے شیشے پر مرکوز۔۔۔ بائیسکوپ والا بدحال شخص چلّائے جا رہا تھا،

''خانہ کعبہ دیکھو۔۔۔ مدینہ شریف دیکھو۔۔۔ تاج محل آگرہ دیکھو۔۔۔ نومن کی دھوبن دیکھو۔۔۔ دِلّی کا دربار دیکھو۔۔۔ امریکہ کا بازار دیکھو۔۔۔ چین کی دیوار دیکھو۔۔۔''

پھر ایک خیمے میں داخل ہوئے۔ باہر تھڑے پر ایک شخص عجیب و غریب لباس پہنے، کود پھاند کر رہا تھا۔ اندر پٹاریوں میں لہراتے۔۔۔ سرسراتے سانپ۔۔۔ جوگیا لباس میں ایک شخص سانپ کا زہر چوسنے والا منکا دِکھا کر، اس کے 'جملہ فیوض و برکات' پر روشنی ڈال رہا تھا۔

ساتھ میں Stuff کیے ہوئے سانپ اور نیولا دھرے تھے۔ پردہ اُٹھا کر اگلے حصے میں گئے تو عجب نظارہ تھا۔۔۔ ایک میز پر ملگجا سا کپڑا یوں پڑا ہوا تھا کہ بڑا سا ڈبا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے اُوپر ایک عورت کا سر تھا اور دھڑ لومڑی کا۔ عورت کی آنکھوں میں بے پناہ کاجل اور چہرے پر بے تحاشہ میک اپ لتھڑا ہوا تھا۔ میں نے اردلی چاچا کی انگلی زور سے تھام لی۔

ایک اور بدحال شخص کا اس سے مکالمہ ہوا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''نور بانو۔''

(یہ تو کہیں سے بھی نور بانو نہیں لگتی۔ ماں باپ نام رکھتے وقت ذرا بھی خیال نہیں رکھتے۔۔۔ بھائی نے میرے کان میں کہا)

''کیا پیتی ہو؟''

''بنٹے والی بوتل''

''کیا کھاتی ہو؟''

''کول ڈوڈے'' (کنول کے بیج)

میں حیرت زدہ اور دکھی ہو گئی۔ بنٹے والی بوتل تک تو ٹھیک تھا۔۔۔ لیکن یہ 'کول ڈوڈے' کھا کر پیٹ کیسے بھرتی ہو گی؟

میری طرح اور بچے بھی، زرد چہرے لیے ہوئے باہر نکلے۔

ع جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

معلوم نہیں ہم پیسے خرچ کر کے، خوف خریدنے کیوں گئے تھے؟ اور یہ کس قسم کی تفریح تھی؟ کئی راتوں تک، سونے سے پہلے نور بانو کی آنکھیں اندھیرے میں مٹکتی دکھائی دیتی رہیں اور اس کے علاوہ یہ افسوس کہ میں نے چادر اٹھا کر کیوں نہ دیکھا کہ میز کے نیچے کیا تھا؟

لیکن اچھا ہی ہے۔۔۔ کچھ باتیں پردے میں ہی رہنی چاہئیں۔

○○○

لے پالک

بڑے بھائی جان کہتے:

''ہم چار بہن بھائی تھے۔ ایک بہن اور تین بھائی۔۔۔ لیکن ہمارا دل چاہتا تھا کہ ہماری ایک چھوٹی بہن بھی ہو۔ پاکستان بننے کے تین سال بعد ایک سکھ فیملی ہندوستان واپس جا رہی تھی ہم نے ان سے ایک بچّی لے لی۔۔۔ وہ تم ہو۔''

اور میں چلّاتی،

''نہیں ایسا نہیں ہے۔''

پھر میں امّی کے پاس بھاگی جاتی۔۔۔ تصدیق کے لیے۔ امّی بڑے رسان سے کہتیں۔

''تمہیں پتا ہے وہ تمہیں چڑانے کے لیے کہتے ہیں۔۔۔ تم تو میری سب سے چھوٹی بیٹی ہو۔''

مجھے تسلّی ہو جاتی، لیکن دو چار دن بعد پھر یہی قصّہ۔۔۔

ابا جی قصور میں تعینات تھے۔ گنڈا سنگھ والا کے بارڈر پر ان کی ہندوستانی پولیس

افسروں سے، مہینے میں ایک دفعہ میٹنگ ہوتی۔ ایک بار میرے کہنے پر ابا جی مجھے ساتھ لے گئے بارڈر دکھانے۔ بڑے بھائی جان بھی ساتھ تھے۔ میٹنگ کے بعد ابا جی نے ہمیں ہندوستانی افسروں سے ملایا۔ ان میں ایک سکھ ایس۔ پی تھے، وہ کہنے لگے:

''بیٹا میں تمہارا چچا ہوں۔۔۔ مجھے دیکھو، سکھ ایسے ہوتے ہیں۔ تمہاری امّی تمہیں بتاتی ہوں گی۔''

واپسی پر بڑے بھائی جان نے آہستہ سے مجھے کہا،

''یہ وہی تھے، جن سے تمہیں گود لیا تھا۔''

میرا رنگ فق ہو گیا۔

ابا جی کو معلوم ہوا تو انہوں نے میرے سامنے بڑے بھائی جان کو سمجھایا کہ آپ تو مذاق کرتے ہیں لیکن اگر اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تو مشکل ہو گی۔ اس کے بعد پھر کبھی بڑے بھائی جان نے مجھے ایسے نہ کہا۔

ooo

بالائی والا دودھ

بچپن میں، مَیں دودھ شوق سے نہیں پیتی تھی اور چائے تو بالکل بھی نہیں۔ ایک بار آپا کو اپنی دوست کے ہاں جانا تھا۔ میں اور بڑے بھائی جان ان کے ساتھ گئے، چائے آئی تو ظاہر ہے میں نے منع کر دیا۔ جب آپا کی دوست نے اصرار کیا تو بھائی جان کہنے لگے،

''دراصل یہ دودھ پیتی ہے وہ بھی بالائی والا۔''

وہ دودھ کا ہاتھ بھر لمبا گلاس، لے آئیں بالائی سمیت۔۔۔ اور

ع اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

اب دودھ۔۔۔ اور وہ بھی بالائی والا۔۔۔ میرے تو حلق سے نہ اترتا تھا۔ آپا کی دوست کہتی جا رہی تھیں،

''میں جانتی ہوں آپ کے گھر خالص دودھ ہوتا ہے۔۔۔ یہ بازار کا ہے۔۔۔ پیو تو سہی۔۔۔ اچھا ہے۔''

اور میں بھاگنے کے لیے راستہ ڈھونڈ رہی تھی۔

OOO

ہچ۔۔۔ ہچ۔۔۔ ہچکی

میں تیسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ سکول سے واپس آئی تو مجھے ہچکی لگی تھی۔ امی کہنے لگیں۔

''رمضان آیا تھا (ہمارے گھر کے پاس اس کی چھوٹی سی دوکان تھی۔ میں ضرورت کے مطابق اس سے سٹیشنری لیتی رہتی تھی) کہہ رہا تھا کہ صبح چھوٹی بی بی دکان پر آئی تھیں اور پین دیکھتے دیکھتے میرا ایک پین توڑ گئیں ہیں۔''

میں نے امی کو بتایا کہ میں تو آج ان کی دوکان پر گئی ہی نہیں۔ امی کہنے لگیں۔

''وہ جھوٹ تو نہیں کہتا نا! غریب آدمی ہے، میں نے اسے پین کی قیمت دے دی ہے لیکن تمہیں بتانا تو چاہیے تھا۔''

''امی میں ان کی دوکان پر گئی ہی نہیں تو پین کیسے ٹوٹا اور میں آپ کو کیا بتاتی؟''

امی نے کہا:

''اب بھی سوچ لو۔۔۔ اگر ایسا ہے تو مجھے بتا دو۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔''

جواباً میں نے چلّانا شروع کر دیا تو امی ہنس پڑیں۔

''ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔ میں تو صرف تمہارا دھیان بٹانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ دیکھ لو۔۔۔ تمہاری ہچکی غائب ہوگئی ہے۔''

اندر کا بُو

سب سے بڑی بہن۔۔۔ پھر تین بھائی اور پھر میں۔ بھائیوں کے ساتھ۔۔۔ خاص طور پر چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتے میں خود کو لڑکا سمجھتی تھی۔ مجھے گھر میں کہتے بھی بُو تھے۔ جب سکول میں داخلہ لیا تو ضروری تھا کہ مجھے سمجھایا جائے کہ میں 'دراصل' لڑکی ہوں۔ مجھے تھوڑا سا یاد ہے کہ اس سالگرہ پر مجھے نیل پالش لے دی گئی (اگرچہ آپا بھی اسے استعمال نہیں کرتی تھیں) صرف یہ ترغیب دلانے کے لیے کہ میں خود کو لڑکی سمجھنا شروع کردوں۔ چونکہ گھر میں بے جا پابندیاں نہیں تھیں اس لیے میرا پھر کبھی دل نہیں چاہا کہ میں لڑکا ہوتی۔ جیسا کہ عام لڑکیاں حسرت سے کہتی ہیں، لیکن اب بھی جب اپنا بچپن یاد کرتی ہوں تو میرے اندر کا 'بُو' بلک کر روتا ہے۔

ooo

یاد۔۔۔ دریچہ

شدید سردی میں یوں لگتا کہ رضائی میں میرے پاؤں نہیں، برف کے ٹکڑے رکھے ہوں۔ امّی، روزانہ میرے ساتھ لیٹ کر میری رضائی گرم کرتیں اور پتا نہیں کب میں گہری نیند سو جاتی۔ کبھی کبھار میری آنکھ بارش کی آواز سے کھل جاتی۔

چھت پر زوردار بارش کی آواز۔۔۔ جھائیں جھائیں۔۔۔ ٹپ ٹپ، میں بستر میں چھپی سنتی رہتی۔ کبھی کبھی، بجلی کی کڑک مجھے دہلا دیتی، لیکن میں پھر بھی کوشش کرتی کہ جاگتی رہوں اور یہ آواز سنتی رہوں۔ بارش کی آواز۔۔۔ رات میں آنکھ کھُل جانے پر بارش کی آواز مجھے آج بھی بہت Fascinate کرتی ہے۔

رات میں ہونے والی بارش کے بعد، صبح بہت سرد اور نکھری ہوئی ہوتی۔ گہرا نیلا آسمان، چمکیلی دھوپ اور گیلی زمین۔۔۔ درختوں پر بیٹھی ہوئی چڑیاں صحن میں اتر آتیں۔ امّی ان کے کھانے کے لیے دانے اور چاول بکھیر دیتیں۔ میں اور چھوٹے بھائی، مرغیوں کو بند کرنے والے ٹاپے کے ساتھ رسّی باندھ کر انہیں پکڑنے کی کوشش کرتے۔ آج تک کوئی چڑیا ہاتھ نہیں لگی لیکن ہر بارش کے بعد، ٹاپا ضرور لگایا۔ من میں آس کی پھانس، لگی رہے تو

زندگی میں رنگ باقی رہتے ہیں۔

سردیوں کی ٹھٹھرتی ہوئی صبح میں باورچی خانے سے نکلتا ہوا سرمئی دھواں۔۔۔ پراٹھوں کی خوشبو۔۔۔امّی کی محبت کی گرمی۔۔۔ مجھے یوں اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے جیسے ابھی کل ہی کی تو بات ہے۔۔۔لیکن ذرا مڑ کر نظر ڈالوں تو وقت کی ایک بڑی خلیج، آج اور گزرے ہوئے کل کے درمیان حائل ہے جسے پار کرنا تو مشکل ہے ہی، اسے بھول پانا بھی ناممکن ہے۔

ع گاہ قریب شہ رگ، گاہ بعید از وہم وخواب

ooo

ادبی پارہ

پاکستان ٹائمز گروپ کا ہفتہ وار رسالہ 'لیل ونہار' سبطِ حسن کی ادارت میں نکلتا تھا۔ میں اس وقت آٹھ سال کی رہی ہوں گی۔ میں نے بڑے بھائی جان سے کہا:

''اس میں بچوں کا صفحہ کیوں نہیں ہوتا؟''

وہ کہنے لگے ایڈیٹر کو خط لکھو۔ میں نے لکھ دیا، بھائی جان نے اسے پوسٹ کر دیا۔ اتفاق سے وہ ایڈیٹر کی ڈاک میں چھپ بھی گیا۔ اب میں ہر آنے جانے والے کو فخر سے دکھاتی۔ جب کوئی مہمان گھر میں آتا اور میں کتابوں کی الماری کا رخ کرتی تو چھوٹے بھائی کہتے:

''اب یہ اپنا 'ادبی پارہ' دکھانے جارہی ہے۔''

ooo

امرت دھارے کی چٹنی

۱۹۵۸ء ہم قصور میں تھے تب امّی بہت بیمار ہوئیں اور میوٗ ہسپتال لاہور میں داخل تھیں۔ بڑے بھائی جان لاء کالج میں پڑھتے تھے۔ میں جب امّی سے ملنے لاہور جاتی تو بھائی جان مجھے اپنے ساتھ ہاسٹل لے جاتے، جہاں میں ان کے میس میں دوپہر کا کھانا کھاتی۔ کھانے کے ساتھ چٹنی بہت مزے کی ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے پوچھا کہ یہ کس چیز کی چٹنی ہے؟

بھائی جان کہنے لگے:

''اس میں امرت دھارا ڈالا ہے۔''

(اس زمانے میں امرت دھارا ایک ایسی دیسی دوا تھی جو 'مرض الموت' کے علاوہ ہر تکلیف کا علاج تھی --- کمر درد --- نزلہ --- زکام --- دردِ شقیقہ --- دردِ قولنج۔ بلڈ پریشر اور شوگر کا تب اتنا 'رواج' نہ تھا ورنہ اس کے لیے بھی مؤثر ہوتی۔)

جب امّی صحت یاب ہوئیں تو میں نے ان سے فرمائش کی کہ امرت دھارے کی چٹنی بنائیں۔

امی نے حیران ہو کر کہا:

''وہ کیسی ہوتی ہے؟''

ooo

میلی کچیلی فلورنس نائٹ انگیل

امّی میوٗ ہسپتال لاہور میں داخل تھیں۔ مری عمر اس وقت سات (۷) سال تھی۔ ایک ہفتہ کی شام کو، میں قصور سے ابّا جی کے ساتھ ان سے ملنے گئی۔ میں نے یونیفارم کا سفید فراک پہنا، اوپر کالی بیلٹ لگائی۔ سفید جرابیں اور سیاہ جوتے، ابّا جی کے سفید رومال کو جیسے تیسے موڑ کر سر پر پنوں سے جمالیا اور یوں اپنے خیال میں 'نرس' کے روپ میں امّی کی تیمار داری کرنے گئی۔ بس کے سفر میں، لاہور تک جاتے جاتے، سفید فراک میلا ہو چکا تھا۔ جیسے ہی میں امّی کے کمرے میں داخل ہوئی، آپا نے اس میلی کچیلی 'فلورنس نائٹ انگیل' کو دیکھ کر سر پیٹ لیا، اور میں، جو 'خدمت' کے جذبے کے بوجھ تلے دبی، ان کی طرف فخریہ انداز سے دیکھ رہی تھی، بجھ سی گئی۔ اسی وقت میٹرن بھی راؤنڈ پر آگئیں۔ جب انہیں صورتِ حال کا علم ہوا تو وہ مجھے اپنے ساتھ وارڈ کا 'راؤنڈ' کروانے لے گئیں تو میرے اس 'جذبہ' کی قدرے تسکین ہوئی۔

ooo

ابّا جی کی خواہش پوری ہوئی

۱۹۵۸ء میں امّی بیمار ہوگئیں۔ ہم قصور میں تھے۔ ان کا پتّے کا آپریشن پیچیدگی اختیار کر گیا تھا۔ میو ہسپتال کے البرٹ وِکٹر وارڈ کے ایک صاف شفّاف پرائیوٹ کمرے میں، لیٹی ہوئی میری فرشتہ سی ماں کا تصور، اب بھی مجھے گھبرا دینے کے لیے کافی ہے۔ آپا نے کالج کا ایک سال گنوایا۔ میری خالہ اور بے بے جی (ابا جی کی چچی صاحبہ) نے گھر سنبھالا۔ بڑے بھائی لاء کالج میں تھے۔ ڈاکٹر بھائی نشتر میڈیکل کالج میں تھے میں اور چھوٹے بھائی سکول میں۔

ایک دن بے بے جی کہیں سے تعویذ لے آئیں جس کا علم کسی طرح ابا جی کو ہو گیا۔ بس پھر تو۔۔۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ ابا جی تعویز گنڈوں اور پیروں فقیروں کے بہت خلاف تھے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خاندان پر اتنی مصیبتیں ٹوٹنے کے باوجود کبھی اس طرف دھیان نہیں گیا۔ لوگوں نے بہت کہا، لیکن ایمان نہیں ڈولا۔ ان دنوں ریڈیو پر گانا آتا تھا۔

؎ چل اُڑ جا رے پنچھی کہ اب یہ دیس ہوا بیگانہ
تنکا تنکا چن کر تو نے بستی ایک بسائی
غم نہ کر کہ تیری محنت تیرے کام نہ آئی

گانا شروع ہوتا تو امّی ریڈیو کی آواز اونچی کرنے کو کہتیں۔ ان کی آنکھیں ویران اور چہرے پر حسرت برس رہی ہوتی۔ میں پوری بات تو نہ سمجھ سکتی لیکن میرا دل بیٹھ جاتا۔

ایک رات میرے ذہن پر نقش ہے۔ امّی شدید تکلیف میں تھیں اور میں ان کی طرف دیکھ کر بے چین۔ رات دو تہائی گزر چکی تھی اور میں سو نہیں پا رہی تھی۔ ابا جی مجھے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ میرے کانوں پر ہاتھ رکھ کر مجھے اپنے ساتھ لٹا لیا۔ امّی کے کراہنے کی آواز، مجھے سنائی دینا بند ہو گئی تو نہ جانے میں کب سو گئی۔

آپریشن کے بعد ڈاکٹر نے امّی کو گنڈیریاں چوسنے کو کہا۔ سردیوں میں ان کا بستر دھوپ میں لگا ہوتا۔ ابا جی دوپہر کو آفس سے واپس آتے تو ان کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھتے۔ صفائی کے خیال سے، گنّے گھر پر منگواتے انہیں دھلوا کر چھری سے چھیل کر گنڈیریاں بنا کر دیتے۔ امّی لیٹے لیٹے، آہستگی سے چوستی رہتیں۔ ان کے چہرے پر ممنونیت کی پرچھائیاں ہوتیں۔ امّی زیادہ بیمار ہوتیں تو ابا جی ہمیں بھی بوکھلا دیتے۔ اتنے فکر مند ہو جاتے کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ کبھی عام گفتگو میں کوئی ایسا موڑ آ جاتا تو وہ امّی سے کہتے:

''میں تو آپ کی زندگی میں چلا جاؤں۔ میرا آپ کے بغیر گزارہ نہیں ہوگا۔''

امّی کہتیں:

''میرا ہو جائے گا؟''

ابا جی کی یہ خواہش پوری ہوئی۔

بزم گاہِ عالم سے خلقت گزرتی جاتی ہے۔۔۔ بنا دیکھے۔۔۔ بنا ٹھہرے۔۔۔ لیکن وہ جو آپ کے اپنے ہیں، ان کے گزرنے کے احساس کی آہٹ، ہماری ہستی کی خالی گلی میں گونجتی رہتی ہے۔۔۔ دیر تک۔۔۔ دُور تک!

؎ کہانی ایک ہے لیکن، جدا ہیں واقعے اپنے
تمہیں محشر اُٹھانا ہے، ہمیں محشر میں رہنا ہے (امجد اسلام امجد)

ooo

Noted With Pleasure

صبح پرچہ ہے۔ رات کو پڑھ رہی ہوں۔۔۔ ابا جی آتے ہیں۔

''بیٹا تیاری کیسی ہے؟''

''پتا نہیں ابا جی۔۔۔ ڈر لگ رہا ہے۔''

''نہیں بیٹا۔۔۔ مترس☆ از بلائی کہ شب درمیاں است، گھبرانا نہیں۔۔۔ اور رات کو زیادہ دیر تک نہیں جاگنا۔۔۔ صبح ذہن تازہ رہنا چاہیے اور آپ تو ویسے بھی ماشاءاللہ بہت لائق ہیں۔''

اور جیسے پریشانی کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ صبح دھونسو قسم کا پرچہ حل کر کے ناچتی ہوئی گھر آتی ہوں۔ ابا جی سارا پرچہ دوبارہ حل کرواتے ہیں اور اس دوران امّی پھیرے لگاتی رہتی ہیں۔

''بیٹا۔ پہلے کچھ کھا پی تو لیتیں۔''

رپورٹ آتی تو ابا جی ہر آنے جانے والے کو دکھاتے۔ فخر سے ان کا روشن چہرہ،

☆ اس بلا سے نہ ڈرو جس کے درمیان رات ہے۔

روشن تر ہو جاتا۔ وہ رپورٹ پر دستخط کرتے تو ساتھ لکھتے۔

"Noted with pleasure, thanks to the staff"

اور میں اُچھلتی۔۔۔

''ابا جی۔۔۔ کسی لڑکی کی رپورٹ پر ایسے نہیں لکھا ہوتا، صرف دستخط ہوتے ہیں۔''

ابا جی ہنستے ہوئے کہتے،

''بیٹا۔۔۔ اور لڑکیاں فرسٹ بھی تو نہیں آتیں۔۔۔ میں تو خوشی سے لکھتا ہوں۔''

مجھے سکول میں رپورٹ واپس کرتے ہوئے شرم آتی کہ کہیں مِس منع نہ کر دیں کہ یہ کیوں لکھا ہے؟

○○○

علم بڑی دولت ہے

بہن بھائیوں کی خواہش تھی کہ مجھے کسی انگلش میڈیم سکول میں پڑھایا جائے لیکن ابا جی نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ ان کی ٹرانسفر چھوٹے بڑے شہروں میں ہوتی رہتی ہے، کسی چھوٹے شہر میں انگلش سکول نہ ملا تو وقت ضائع ہوگا۔

پانچویں میں وظیفہ لیا تو یاد نہیں کیسے ہوا تھا؟ بہر حال ہم سب بہن بھائی، چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بھی بہت محبت سے منایا کرتے تھے۔۔۔ قیمتی تحائف اور بڑی بڑی پارٹیاں ہی تو Celebration کا طریقہ نہیں ہیں۔

مڈل میں وظیفہ آیا تو آپا اور بڑے بھائی جان نے میرے لیے گھڑی، پہلے سے ہی خرید رکھی تھی۔ اس زمانے میں گھڑی لینے کے لیے 'چچا جان' کو خط لکھنا پڑتا تھا جو کہ نصاب میں بھی شامل تھا۔ اس کے بغیر ہی گھڑی کا مل جانا، مجھے حیران کر گیا۔

جب کسی سے تحفہ ملتا ہے تو مجھے، ہمیشہ وہ چیز نہیں بلکہ یہ بات زیادہ Fascinate کرتی ہے کہ تحفہ خریدتے وقت، اس شخص نے میرے بارے میں سوچا ہوگا۔ گھڑی کے تحفے کی خوشی اپنی جگہ لیکن اس بات نے مجھے زیادہ تقویت دی کہ آپا اور بھائی کو یقین تھا کہ مجھے

وظیفہ ملے گا۔

میٹرک کے رزلٹ پر بڑے بھائی سروس میں آ چکے تھے وہ مجھے ساتھ لے گئے اور میری پسند کی گھڑی دلوائی اور کہا کہ تمہیں تو وظیفہ لینے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ اس کی قیمت مجھے یاد ہے۔ -/۱۶۰ روپے تھی۔ اس زمانے میں ایک تولہ سونے کی قیمت بھی یہی تھی لیکن میں نے بالکل بھی نہیں چاہا تھا کہ میرے پاس گھڑی کی بجائے کوئی زیور ہو۔ ابا جی کو زیور پہننا پسند نہیں تھا۔ وہ کہا کرتے:

''حاجتِ مشاطہ نیست روئی دلآرام را☆''

اور یہ کہتے ہوئے معنی خیز انداز میں ہنستے اور میری غلافی آنکھوں اور لمبے بالوں والی گوری چٹی ماں کی طرف دیکھتے، جنہوں نے زندگی بھر ابا جی کی خواہش پر زیور نہیں پہنا اور واقعی انہیں ضرورت بھی نہیں تھی۔ ابا جی ہمیں کہتے کہ آپ کی والدہ نے، میرے کہنے پر بہت بڑی قربانی دی ہے۔۔۔ کیونکہ زیور عورت کی کمزوری ہے۔۔۔ میں نے اپنی والدہ کو کبھی اس بات پر شاکی نہیں دیکھا۔

جب میں چھوٹی تھی تو مجھے ایسی چیزوں کا شوق تھا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ میں پانچ چھ سال کی تھی کہ ایک دن بخار آ گیا تو میری فرمائش پر امّی نے اردلی کو بھیج کر کانچ کی چوڑیاں منگوا دیں۔ شام کو ابا جی آئے تو یونیفارم تبدیل کر کے میرے پاس آ گئے اور کہنے لگے۔

''آؤ چوڑیوں سے کھیلیں۔''

تھوڑی دیر کے بعد، چوڑیاں کانچ کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکی تھیں جس سے میں، چھوٹے بھائی اور ابا جی کھیل رہے تھے۔

ایک بار بڑے بھائی جان نے مجھ سے کہا۔

''مرد حضرات باقاعدگی سے گھڑی باندھتے ہیں کیونکہ انہیں وقت کے مطابق کام کرنا ہوتا ہے۔ گھریلو خواتین کو بھی گھڑی باندھنا چاہیے اور تم تو کیریر وومن بنو گی اس کی

☆ خوبصورت چہرے کو سنگھار کی ضرورت نہیں۔

عادت ڈالو۔“

میں سارا وقت گھڑی باندھے رکھتی (شاید کبھی کبھار اس کے ساتھ نہا بھی لیتی تھی کیونکہ اس پر واٹر پروف لکھا تھا) اور جب کوئی وقت پوچھتا تو کہتی۔

”یہ ٹائم ہے "By my Roamer, my pride

(اس کی پیکنگ پر یہی لکھا تھا) اس کے بعد زندگی میں بہت سی گھڑیاں آتی جاتی رہیں لیکن وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔

میں نے اپنی شادی پر ابا جی سے کہا۔

”ابا جی آپ کو خواتین کا زیور پہننا پسند نہیں، مجھے بھی شوق نہیں ہے اس لیے میرے لیے زیور نہ بنوائیں۔“

ابا جی کہنے لگے:

”بیٹا میں کِس کِس کو سمجھانے جاؤں گا کہ اس وجہ سے زیور نہیں دیا۔ آپ کو پسند نہیں تو نہ پہنیے گا۔“

شادی کے کچھ عرصہ بعد، میں میکے آئی تو ابا جی نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور کہنے لگے۔

”بیٹا، میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ زیور نہیں پہنتیں۔ اچھا ہے۔۔۔ آپ کے پاس علم کا زیور جو ہے، لیکن کتنا اچھا ہو کہ آپ اپنے حلقے میں بھی خواتین کو اس پر آمادہ کریں۔“

میں نے کہا۔

”ابا جی یہ ناممکنات میں سے ہے۔ آپ سچ کہتے ہیں زیور، عورت کی کمزوری ہے یا اس نے بنالی ہے۔ وہاں تو اکثر خواتین کی گفتگو، زیور سے شروع ہو کر زیور پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ کمیٹیاں ڈالی جاتی ہیں۔ لڑائیاں لڑی جاتی ہیں۔ فرمائشیں ہوتی ہیں۔“

میری شادی پر امّی نے ابا جی سے کہا۔

”جہیز کی لسٹ بنا دیں کہ رسمِ دُنیا ہے۔“

ابا جی بمشکل راضی ہوئے اور لسٹ بنا دی۔ سر فہرست لکھا،
’ایم۔ ایس۔ سی کی ڈگری۔ علم بڑی دولت ہے۔ آزمائش شرط ہے۔‘
میں نے وہ فہرست سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔

ooo

اِک خواہش ایسی۔۔۔

ایف۔ ایس۔ سی کے رزلٹ نے ڈاکٹر بننے کے میرے خواب کو چکنا چور کر دیا۔ جس میں میری نا اہلی کو تو دخل تھا ہی، کچھ تقدیر نے بھی ساتھ نہ دیا۔ تب سرگودھا بورڈ نیا نیا بنا تھا۔ میرا ایک پرچہ گم ہو گیا۔ بھاگ دوڑ کرنے کے بعد، میڈیکل کالج میں داخلہ کے لیے اپلائی کرنے سے ایک روز پہلے، رزلٹ ملا۔ اوسط نمبر لگنے کی وجہ سے کل نمبر کم ہو گئے اور داخلے کے لیے ایک نمبر کم پڑ گیا۔ یہ عید کے دن تھے۔ عید سے پہلے یہ معلوم ہو گیا تھا لیکن ڈاکٹر بھائی نے بتایا نہیں، کہنے لگے:

"تم اپنی اور ہماری عید غارت کر دیتیں۔"

میں بھی ایسے روئی، جیسے زندگی میں کچھ باقی نہ رہا ہو۔ سبھی نے ڈھارس بندھائی۔ ڈاکٹر بھائی کہنے لگے۔

"میں نے تو تمہارے داخلے کے لیے رقم بھی الگ کر رکھی تھی۔"

میں اور دھائیں رونے لگی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور جاب مل جانے کے بعد ڈاکٹر نہ بننے کا صدمہ کم

ہو گیا اور اب تو میں سوچتی ہوں، کہ بہتر ہی ہوا کیونکہ اب میری غائب الدماغی کا یہ عالم ہے کہ مریض بیت جاتا اور مجھے دوا کا نام یاد نہ آتا۔ لیکن زندگی کی اندھیری راتوں میں ڈاکٹر بھائی کی محبت بھری بات اب بھی لو دیتی ہے۔ شاید وہ لوگ اس بات کو نہ سمجھ سکیں جو محبتوں کے قدر دان نہیں۔

ع جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

ان حالات میں مَیں شدید احساسِ کمتری کا شکار ہو گئی۔ باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ ہر وقت یہ خیال لگا رہتا کہ کوئی پوچھے گا کہ آج کل کیا کر رہی ہو تو کیا جواب دوں گی؟ ایسے میں بڑے بھائی جان نے سنبھالا۔ کہنے لگے۔

"بی۔ اے کے امتحان میں کچھ عرصہ باقی ہے، بس کھڑکا دو۔"

اور میں نے واقعتاً تین ماہ اور بیس دن کی تیاری سے اچھا بھلا 'کھڑکا دیا'۔

بی۔ اے کا رزلٹ آیا تو اباجی کی آنکھیں، آنسو لیے ہوئے تھیں۔

"لیجیے۔۔۔ آپ تو رو رہے ہیں اباجی۔۔۔ یہ تو خوشی کی بات ہے" (بچپنا)

اباجی نے کہا۔

"یہ خوشی ہی کے تو آنسو ہیں۔ میں نے ایک ہی خواہش کی تھی زندگی میں کہ میری ساری اولاد گریجوایٹ ہو جائے۔" پھر خوب ہنسے اور کہنے لگے۔

"جب میں نے یہ خواہش کی تھی، تب گریجوایشن بہت بڑی بات تھی۔ آپ میرے بچوں میں سب سے چھوٹی ہیں آج میری خواہش پوری ہو گئی ہیں۔ میں خوش قسمت ہوں، بہت کم لوگ ہوتے ہیں کہ جو وہ مانگیں، انہیں زندگی میں مل جائے۔"

ooo

''تم پاگل ہو''

چھوٹے بھائی کی ایم۔ایس۔سی مکمل ہونے والی تھی، جب میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ یوں تو ہمارے ڈیپارٹمنٹ الگ الگ تھے لیکن شروع میں، وہ کبھی کبھار میرے ڈیپارٹمنٹ کا چکر لگا لیتے کہ مجھے کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔

دوسرے سمسٹر میں Enrolment کے وقت میری فیکلٹی کے ڈین صاحب نے فارم پر دستخط کرنے کے ساتھ ساتھ، طلباء سے سوالات کرنے شروع کر دیے۔ وہ میری 'علمیت' سے بہت متاثر ہوئے اور بے حد تعریف کی جو ہوتے ہوتے ڈیپارٹمنٹ میں سب کو معلوم ہو گئی۔ چھوٹے بھائی نے بھی، کہیں سے سن لیا۔ گھر آئی تو وہ کہنے لگے۔

''فیکلٹی میں تو تمہاری بہت 'ٹور' بن گئی ہے۔ سنا ہے ڈین صاحب کہتے ہیں یہ ڈیپارٹمنٹ کی سب سے اچھی سٹوڈنٹ ہے، لیکن وجہ یہ ہے کہ تم اصلی بات کو، کامیابی سے چھپا گئیں۔''

اور میں حیران کہ میں نے کون سی بات چھپائی ہے؟ کہنے لگے۔

''کیا تم نے یہ بات نہیں چھپائی کہ۔۔۔ تم پاگل ہو۔''

ooo

عادت ہی بنا لی ہے۔۔۔

صبح میں یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو جاتی تو آواز لگاتی۔

''چلیے۔۔۔ چھوٹے بھائی۔۔۔ میں تیار ہوں۔''

وہ تمسخرانہ انداز میں ہونٹوں کو دبا کر کہتے:

''تیار ہو؟۔۔۔ اچھا؟۔۔۔''

سارا دن مجھے یہ خیال ستاتا کہ بھائی نے یوں کیوں کہا تھا؟ کبھی اپنی دوست سے پوچھتی۔

''میں ٹھیک لگ رہی ہوں؟''

اس کا جواب اثبات میں ہونے پر بھی، میرا اعتماد بحال نہ ہوتا۔ واپس میں ڈاکٹر بھائی کے ساتھ آتی۔ گھر پہنچتے ہی چھوٹے بھائی کے لتّے لیتی کہ آپ نے یوں کیوں کہا تھا؟ وہ معصومیت سے کہتے،

''کیا کہا تھا میں نے؟ یہی تو پوچھا تھا کہ تیار ہو۔''

اس کا بدلہ میں یوں لیتی کہ باتوں باتوں میں انہیں 'تپا' دیتی۔ وہ چڑچڑے پن کا

مظاہرہ کرتے میں تھوڑی اور ہوا دیتی۔ ان کا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگتا تو میں اِدھر اُدھر سٹک جاتی۔ بات ٹھنڈی پڑ جاتی تو پھر گھوم گھام کر آ جاتی۔

''بھائی شعر سنیے۔۔۔ ابھی ابھی کہا ہے۔''

وہ اپنے گذشتہ رویّے کو معذرت خواہانہ انداز میں دباتے ہوئے کہتے،

''کہو''

''اونہوں۔۔۔ ارشاد کہیے نا''

وہ بادل نخواستہ 'ارشاد' کہتے تو میں 'عرض' کرتی

؎ عادت ہی بنا لی ہے تم نے تو 'مسعود'☆ اپنی
جس 'حال' میں بھی رہنا 'گھبرائے' ہوئے رہنا

اور ان کا پارہ، جو بمشکل نارمل تک پہنچا تھا، سکیل پر دوبارہ 'خطرے کے نشان' کو چھونے لگتا۔

○○○

☆ چھوٹے بھائی کا پورا نام 'مسعود صفدر' تھا۔

فوڈ ٹیکنالوجی

چھوٹے بھائی نے ایم۔ ایس۔ سی فوڈ ٹیکنالوجی کی تھی۔ یہ شعبہ ان کی پسند کے مطابق تھا۔ وہ صرف کھانے کے ہی شوقین نہیں تھے۔۔۔ پکانے کے بھی تھے۔ گھر میں کچھ نہ کچھ، چھیڑ چھاڑ کرتے ہی رہتے۔ خود تو جم کر چولہے کے پاس بیٹھ جاتے اور میری کمبختی شروع ہو جاتی۔

''پیاز لا دو۔''

''یہ کٹ گیا ہے اسے دھو دو۔''

''وہ مصالحہ پکڑانا۔''

''ایک پلیٹ دینا ذرا سا چکھ لوں۔''

''کپڑا دینا دم لگانے کے لیے۔''

اور ایسی ہی باتیں۔ میں زچ ہو کر کہتی:

''ہمیں کچھ نہیں کھانا۔ آپ کچن سے نکلیں۔''

بھائی کہتے:

"دیکھو ذرا۔۔۔ایک تو پکا کر دو۔۔۔اوپر سے شور۔۔۔واہ واہ۔"

عید پر خود کھانے بناتے، ہمیں بالکل کچھ نہ کرنے دیتے۔ کہتے:

"جاؤ۔۔۔عیش کرو۔"

کھانا بھی ایسی لذیذ ہوتا کہ انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ۔ بقر عید پر، کوئلوں کی تیز آنچ والی انگیٹھی پر جو کڑاہی گوشت بناتے، ویسا اچھے اچھوں کے لیے بنانا مشکل ہے۔ بناتے بھی بہت وافر مقدار میں اور توقع رکھتے کہ بالکل ختم ہو جائے، ورنہ انہیں شک رہتا کہ مزے کا نہیں بنا۔

ooo

ضیافت

گرمیوں میں، ہم آئے دن گھر میں آئس کریم بناتے۔ برف، قلمی شورہ۔۔۔اور نمک۔۔۔مشین کی گھر گھراہٹ۔۔۔ارد گرد بیٹھے ہوئے بہن بھائیوں کے قہقہے۔۔۔رات کو سفید چادروں والے بستر ایک لائن میں بچھے ہوتے۔ امّی صحن میں ہی تخت پر کھانا چنتیں خشکہ چاول۔۔۔آلو کی بھجیا۔۔۔رائتہ اور آم کی آئس کریم۔ تب میں کھانے کی اتنی شوقین نہیں تھی۔ لیکن اب بے طرح دل چاہتا ہے کہ امّی کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھاؤں۔

ooo

قیلولہ

گرمیوں میں ایک کمرے کے دروازے پر خس کی چق لگا دی جاتی۔ اس کے پاس ایک بالٹی میں پانی اور مگ رکھا رہتا۔ آتے جاتے اس پر ایک مگ پانی ڈال دیا جاتا، اس کے پیچھے ایک چھوٹا سا ٹیبل فین ہلکی ہلکی ہوا پھینکتا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد سب لوگ اس کمرے میں سوتے۔ میں اور بھائی۔۔۔ امّی ابا جی کے کہنے پر لیٹ تو جاتے لیکن اس انتظار میں رہتے کہ کب وہ سوئیں اور کب ہم کھسکیں۔ میں ساتھ کے کمرے میں رسالوں کا ڈھیر لگا دیتی۔ گھر میں آنے والے خربوزوں کے بیج دھو کر، امّی جمع کر دیتیں۔ میرے پاس ان کی ایک پلیٹ ہوتی۔ پیٹ کے بل دری پر لیٹ کر رسالے پڑھتی اور انہیں ٹھونگتی رہتی۔ بھائی لئی بنا کر لے آتے۔ ہم پرانے رسالے اور پتنگیں مرمت کرتے اور شام ہو جاتی۔

ooo

بہتی قلفیاں

دوپہر میں سب سو رہے ہوتے تو کبھی کبھار میں اور بھائی قلفی جمانے کی سوچتے۔۔۔ لکڑیوں کے چولہے پر دودھ کو گاڑھا کیا جاتا (اگر آگ صحیح طرح سے نہ جل پاتی تو لگتا کہ قلفی کو دھوئیں کا 'دھنگار' لگایا گیا ہے) سائیکل کی پرانی ٹیوب کے بینڈ کاٹے جاتے، بادام اور الائچی کو کپڑے میں ڈال کر مرچ پیسنے والے ڈنڈے سے کوٹا جاتا (اس لیے کبھی کبھار قلفی میں لہسن کی ہیک بھی آنے لگتی) قلفیاں بھر کر، بینڈ چڑھا کر، ان کو برف، قلمی شورہ اور نمک ملے پانی سے بھرے گھڑے میں چھوڑ دیا جاتا۔ میں اور بھائی باری باری گھڑے کو ہلاتے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بھائی ایک قلفی نکالتے اور اسے کھولتے۔۔۔ جو یقیناً جمی ہوئی نہیں ہوتی۔ اسے ہم دونوں مل کی 'پی' جاتے۔۔۔ جب تک گھر والے سو کر اُٹھتے، دو چار بہتی ہوئی قلفیاں ہوتیں اور پورے باورچی خانے میں ان کے آثار۔

ooo

گرمیوں کی شاموں میں

گرمیوں کی شامیں، بہت گہما گہمی والی ہوتیں۔شام سے پہلے صحن میں چھڑکاؤ کر دیا جاتا۔چارپائیاں بچھا کر، ان پر سفید چادروں والے بستر ڈال دیے جاتے۔ایک طرف پیڈسٹل فین لگا ہوتا۔میں گھر بھر کی لاڈلی تھی اس لیے پیڈسٹل فین کے ساتھ والا بستر، ہمیشہ مجھے ملتا۔گھڑوں کو دھو کر، ان میں تازہ پانی بھرا جاتا۔شربت اور بادام کی ٹھنڈائی بہت اہتمام سے، اور بلاناغہ بنائے جاتے۔رات کا کھانا بھی چارپائیوں کے پاس تخت پر رکھ دیا جاتا۔میں ایک چارپائی سے دوسری پر، کودتی رہتی۔چاند کی روشنی میں ٹھنڈک کا احساس، رات گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھ جاتا۔اب بھی گاؤں جاؤں تو مجھے رات کو صحن میں سونا اچھا لگتا ہے۔

ooo

دو بڑے Event

اُن دنوں گھر کے دو بڑے Event اچار ڈالنا اور سویاں بٹنا ہوتے۔

سارا سال امّی مختلف قسم کے اچار چٹنیاں بناتی رہتیں، لیموں، گاجر، آملہ، لسوڑھے، ڈیلے، سبزیاں اور کیا نہیں، لیکن جولائی کے مہینے میں آم کا اچار زیادہ مقدار میں بنایا جاتا، جسے امّی 'سال بھر کی ہنڈیا' کہتیں۔اچار ڈالنے سے ایک ہفتہ پہلے اس کی تیاری شروع ہو جاتی۔امّی مصالحے صاف کرتیں، انہیں دھوپ دکھاتیں، مرتبان صاف کرواتیں، کافی مقدار میں لہسن چھیلا جاتا، چنے صاف کیے جاتے، پھر تقریباً ایک من، کچے آم دھو کر پنکھے کے نیچے کپڑے پر پھیلا دیے جاتے اور میں ان کے گرد، چکّر لگانا شروع ہو جاتی۔گدرے ہوئے آم، امّی اچار میں نہ ڈالتیں ان سے چٹنی بنائی جاتی، میری نظر ان پر ہوتی۔نمک مرچ لگا کر کچر کچر کھائے جاتی، اب تو سوچ کر ہی جھرجھری آ جاتی ہے۔

دو دن گھر بھر سے، اچار مصالحے کی مخصوص خوشبو آتی رہتی اور پھر نئے اچار اور دہی کے ساتھ پراٹھا۔۔واہ، واہ۔۔۔

سوجی اور میدے کی سوّیاں، مختلف سائز کی چھلنیاں لگا کر بٹی جاتیں۔آٹا، امّی

گوندھتیں۔ خالہ جان آئی ہوتیں تو وہ 'گھوڑی' (سوّیاں بٹنے والی مشین) چلاتیں۔ میں ٹکٹکی باندھ کر مشین میں سے نکلنے والی سوّیوں کی آبشار کو دیکھتی رہتی۔ چارپائیوں کو چوڑے رخ پر دھوپ میں کھڑا کر کے مچھر دانی کی لاٹھیاں دھو کر، اس پر رکھ دی جاتیں۔ گیلی سوّیاں ان پر کپڑوں کی مانند، سکھائی جاتیں۔ امّی ان کو مختلف انداز میں پکاتیں۔۔۔ ہر انداز انتہائی لذیذ۔۔۔

ooo

بے پروائیاں

رات کو سونے سے پہلے جب میں امّی کے پاس لیٹتی تو وہ مجھے سورتیں، نماز اور کلمے یاد کرواتیں۔ جو میں بہت جلد یاد کر لیتی جس پر وہ خوش ہوتیں اور مجھے پیار کرتیں۔

جب وہی سورتیں، اسلامیات کی کلاس میں، ٹیچر مجھے یاد کرنے کو کہتیں تو ظاہر ہے مجھے وہ پہلے سے یاد ہوتیں۔ میں انہیں ایک بار دُہرا کر شرارتیں کرنے لگتی اور شاباش کی بجائے ڈانٹ کھاتی۔

سکول سے یہی رپورٹ آتی کہ ذہین بہت ہے لیکن شرارتی اور بے پروا ہے۔ اباجی کہتے یہ رویہ صحیح نہیں ہے، جس پر امّی کہتیں،

"اب وہ فرسٹ تو آتی ہے۔۔۔ اور کیا کرے؟"

سلائی کڑھائی اور کھانے پکانے میں، مجھے رغبت نہیں تھی اس لیے، خانہ داری کے مضمون میں ہمیشہ مسئلہ ہوتا۔ آپا ان کاموں میں ماہر تھیں وہ میری مدد کرتیں تب کہیں جا کر کچھ بات بنتی۔ آپا کے شوق کو دیکھتے ہوئے اباجی نے درزی کو گھر پر بلا کر انھیں سلائی سکھائی تھی۔ جب وہ میز پر درزی ہی کی طرح، کھڑے ہو کر کپڑوں کی کٹائی کرتیں تو میں اُچھل کر میز کے

ایک کونے پر بیٹھ جاتی اور گپیں ہانکنے لگتی۔ امّی کہتیں،

''ساتھ ساتھ بہن سے کچھ سیکھ بھی لو۔''

میں بڑے یقین سے کہتی،

''امّی، یہ سب کرنا تو مجھے ہرگز نہیں آئے گا۔''

آپا کہتیں،

''اگر فرسٹ آسکتی ہو تو یہ کرنا کیوں نہیں آئے گا؟''

آپا کی شادی کے بعد، میں نے اس طرف دھیان دیا۔

ooo

بِلاضرورت گفتگو اور سلیمانی ٹوپی

بڑے بھائی جان اور میں گھر میں سب سے زیادہ باتیں کرنے والے تھے 'بلاضرورت' بھی کافی گفتگو کر لیتے وہ کہتے،

''میں ایک فلم بنانے والا ہوں وہ اس سین سے شروع ہوگی۔''

وہ سین روزمرّہ میں کہیں سے بھی مل جاتا۔

ایک بار میں اور بھائی جان کسی عزیز کو دیکھنے ہسپتال گئے۔ نرس، ان کے بیڈ کا لیور گھما کر ان کا سر اُونچا کر رہی تھی۔ بھائی جان نے آہستگی سے کہا،

''میری فلم اس سین سے شروع ہوگی۔ مریض بستر پر پڑا ہوگا دو Attendant اس کے بیڈ کے لیور گھما کر دونوں طرف سے بیڈ اُونچا کر دیں گے مریض اس میں دب جائے گا۔''

اب میں نے تیمارداری تو کیا کرنا تھی، ہنسی ہی نہیں رک رہی تھی۔ میں ہنستی بھی تو بے تحاشا تھی۔ بھائی جان کہتے:

''جتنا تم ہنستی ہو، اتنا سب ہنسیں تو اس دنیا سے غم مٹ جائیں۔''

ایک بار میں نے بڑے بھائی جان سے کہا،

"کاش میرے پاس ایک سلیمانی ٹوپی ہوتی تو میں سب کے دل کی بات جان لیتی، سب کے خیالات معلوم ہو جاتے۔۔۔کتنا مزہ آتا۔"

بڑے بھائی جان نے کہا،

"مزہ آتا؟۔۔۔تمہاری اکثر لوگوں سے ناراضگی ہو جاتی۔"

مجھے دھچکا سا لگا۔

OOO

محبّتیں

ہم لوگ جھنگ میں تھے۔ میں ساتویں جماعت میں پڑھ رہی تھی کہ شدید بیمار ہو گئی۔ آپا لاہور میں، ماموں جی کے پاس رہ کر ایم۔اے کر رہی تھیں۔ بڑے بھائی جان نے لاکرنے کے بعد، قصور میں نئی نئی پریکٹس شروع کی تھی۔ ڈاکٹر بھائی میڈیکل کالج میں تھے اور چھٹی پر گھر آئے ہوئے تھے۔ چھوٹے بھائی زرعی یونیورسٹی لائل پور میں تھے۔ ابا جی نے سب کو تار دے دیے۔

ماموں جی نے اپنے دوست سے کار مستعار لی اور آپا کو لے کر رات دو بجے جھنگ پہنچے۔ بڑے بھائی جان قصور میں، بس میں بیٹھے بے بسی سے اس کے چلنے کا انتظار کرتے رہے۔ صبح سویرے بس چلی تو لاہور سے ہوتے ہوئے دوپہر تک جھنگ پہنچے چھوٹے بھائی کو ابا جی نے سپاہی بھیج کر بلوایا۔ غرضیکہ سب انتہائی پریشانی کے عالم میں گھر پہنچے۔ جھنگ کے، اس زمانے کے بہترین ڈاکٹر، گھر پر جمع تھے۔ تب تک میری طبیعت کافی سنبھل چکی تھی۔

سب اپنی 'روایتی' زندہ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے میرے پاس بیٹھے گپ لگا رہے تھے اور اپنے اپنے سفر کے حالات بتا رہے تھے۔

بڑے بھائی جان نے میرا ہاتھ پکڑا اور 'دست شناسی' شروع کی۔ کہنے لگے:

''اوہو۔۔۔ہو۔۔۔ہو۔۔۔تمہاری تو عمر بہت لمبی ہے۔ چلیں اچھا ہے وقت پر پتا چل گیا۔ آئندہ کوئی ایسی اطلاع آئی تو میں آرام سے پہنچوں گا۔ پریشانی کی کوئی بات نہ ہوگی۔''

مجھے 'کن پھیڑ' نکلے تھے اور دماغ کی جھلّی پر سوزش ہوگئی تھی۔ امّی، سب کو بتانے لگیں۔

''یہ نیم بے ہوش تھی کہ آپ کے ابا جی نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ دماغ پر اثر ہے۔''

چھوٹے بھائی نے لقمہ دیا۔

''چ۔۔۔چ۔۔۔چ۔۔۔ گویا ڈاکٹروں کو بھی پتہ چل گیا کہ یہ بے چاری پاگل ہے۔''

میں، نقاہت کے مارے اور تو کچھ کہہ نہ سکی، ابا جی سے چھپا کر، منہ چڑانے لگی۔

ابا جی پھل چھیل کر، میرے منہ میں ڈال رہے تھے اور خود بھی کھا رہے تھے کہ مجھے چھینک آئی۔

ابا جی نے مجھے ہنسانے کی خاطر کہا:

''بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔۔۔ بیٹا اس کا کیا مطلب ہے؟''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بیمار پڑی تو آپ کو پھل کھانے کو ملے۔''

سب ہنسنے لگے۔

ooo

چرخہ

سردیوں میں، سب جلدی کھانا کھا کر کمروں میں چلے جاتے۔ ابا جی بہت جلد سونے کے عادی تھے۔ ہم بہن بھائی پڑھتے تو امّی ہمارے ساتھ جاگتی رہتیں اور سوت اٹیرتی رہتیں۔ وہ بہت باریک سوت کاتتی تھیں۔ اس سے بنے کھدر سے، بڑے بھائی جان اپنے لیے بشرٹ اور کُرتا پاجامہ بنواتے اور دوستوں کو بھی، تحفے میں دیتے۔ امّی، ان کے لیے خاص طور پر براؤن رنگ کی کپاس منگوا کر، کھدّر بنواتیں۔ کیا کوئی یقین کرے گا کہ ایک اعلیٰ پولیس افسر کے گھریلو سامان میں سدا، ایک چرخہ بھی شامل رہا۔

ooo

آنہ لائبریری اور گلاب جامنیں

میرے چھٹپن میں، گلی محلوں میں چھوٹی چھوٹی لائبریریاں ہوا کرتی تھیں، جو کتابیں کرایہ پر دیتی تھیں۔ انہیں 'آنہ لائبریری' کہتے تھے، کیونکہ ایک کتاب کا ایک دن کا کرایہ ایک آنہ ہوتا تھا۔ میں اور چھوٹے بھائی وہاں سے کتابیں لے کر پڑھتے، جن میں ابنِ صفی کی 'جاسوسی سیریز'، 'گھریلو معاشرتی، اصلاحی ناول' اور افسانوں کے مجموعے شامل ہوتے۔ بھائی تین چار کتابیں اکٹھی لاتے تا کہ جھگڑے کا امکان نہ رہے۔ ہم ان پر تبصرہ کرتے، ڈائیلاگ دُھراتے اور دوبارہ، سہ بارہ پڑھتے۔ کبھی میرا ناول، کسی دل چسپ موڑ پر ہوتا اور کھانے کا وقت ہو جاتا تو میں ببانگِ دہل اعلان کر دیتی کہ مجھے بھوک نہیں ہے۔ بھائی اندر کی بات جان کر، مجھ سے کتاب چھین لیتے اور کہتے۔

''اب اس سے پوچھیں۔۔۔ بھوک ہے یا نہیں؟''

یہ مہابھارت چھڑ جانے کا سبب بنتا۔

چاندنی رات، میں صحن میں بستر پر لیٹ کر، ناول پڑھنا اور ساتھ میں، ریڈیو پر گانوں کا فرمائشی پروگرام سننا، اس زمانے میں تفریح کی انتہا تھی۔ طوفانی رات میں بجلی چلی

جاتی تو لالٹین کی روشنی میں ناول پڑھا جاتا۔ تیز ہوا سے لالٹین بھک سے بجھ جاتی۔ اس کو مشکلوں سے پھر جلا کر، ناول کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے، پھر جوڑا جاتا۔ ہاتھوں سے مٹی کے تیل کی بُو، چھڑانے کا بھی وقت نہ ہوتا۔

'گھریلو' ناولوں میں کھانے کی ترکیبیں بھی درج ہوتیں یا کم از کم ان کا ذکر بہت تفصیل سے ہوتا، سموسوں کی بات ہوتی تو میں آپا کے پاس جاتی۔

''آپا آج سموسے بنائیں؟''

اور اگر گلاب جامن کا ذکر ہوتا تو میں پھر، ان کے پاس جاتی۔

''آپا۔۔۔ گلاب جامن بنائیے، بہت دن ہو گئے۔''

اس پر آپا کہتیں،

''پیٹ بھر کر ناول پڑھنے بیٹھا کرو۔''

اب بھی کبھی گزرتے گزرتے ویسی لائبریری نظر آ جائے تو یادوں کی نیلی جھیل کا دوسرا کنارہ دھندلا جاتا ہے۔ پہلے چھوٹے بھائی کی دوسراہٹ میں ابنِ صفی کو پڑھا۔ پھر ان کی وفات کے بعد جب میں بے خوابی کا شکار ہو گئی تو ڈاکٹر بھائی، وقت گزاری کے لیے مجھے بھی کتابیں لا کر دیتے۔ بار بار دل کہتا کہ صبح بھائی کو بتاؤں گی کہ ناول کیسا تھا، لیکن مایوسی مجھے مزید بے خواب کر دیتی۔

؎ ای کہ گفتی ہیچ مشکل چوں فراقِ یار نیست☆
گر اُمیدِ وصل باشد آنچناں دشوار نیست

ooo

☆ تو جو کہتا ہے کہ فراقِ یار جیسی کوئی مشکل نہیں ہے اگر وصل کی امید ہو تو یہ اس قدر مشکل نہیں ہے۔

کشمیری پردادی کا پرتو

اباجی کے داداجی نے دوسری شادی ایک کشمیری خاتون سے کی تھی جو زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ ان سے کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ ایک روز اباجی نے ایسے ہی برسبیل تذکرہ، ان کا ذِکر کیا تو میں نے آنکھیں گھما کر بڑے تیقّن سے کہا۔

''ہوں۔۔۔ں۔۔۔ں۔۔۔ں۔۔۔جبھی تو میں بھی کہوں آخر میں اتنی 'خوبصورت' کیوں ہوں؟ یقیناً میں اپنی کشمیری پردادی پر پڑی ہوں۔''

اباجی بہت ہنسے اور کہنے لگے۔

''بیٹا۔۔۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ کے داداجی تو ان کی اولاد نہیں تھے۔''

میں چلّائی،

''لیکن میں تو یہ جانتی ہوں کہ میں یقیناً ان ہی کا 'پرتو' ہوں''

اس کے بعد سے چھوٹے بھائی پکارتے۔

''محترمہ 'پرتو' صاحبہ۔۔۔ ذرا بات سنیے آپ کے 'حسن' کی وجہ تو سمجھ میں آ گئی۔ لیکن ہمارے خاندان میں کوئی پاگل تو نہیں تھا پھر آپ۔۔۔''

بس، پھر جو سلسلہ شروع ہوتا تو ختم ہونے کا نام نہ لیتا۔

ooo

''باندری''

خوشیاں تلاش کرنا پڑتی ہیں۔ غم خود سے در آتے ہیں۔ دکھ جگہ جگہ راستہ روکے، کھڑے رہتے ہیں۔ ہم سب یہ بات بخوبی سمجھتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو Enjoy کرنا، کچھ ہمیں جانتے تھے۔ میں گھر کی داستان گو تھی۔ جب قصہ خوب عروج پر ہوتا تو ڈاکٹر بھائی پاس پڑی ہوئی کوئی چیز، میری طرف زور سے پھینکتے اور کہتے:

''باندری۔''

محبت کے شیرے میں لتھڑا ہوا یہ لفظ مجھے اور شوخ کر دیتا۔ قہقہے گونجتے اور بات آگے بڑھتی رہتی۔ بڑے بھائی جان کہتے جو فلم ہم سینما میں ایک دن دیکھتے ہیں، وہ گھر میں پندرہ دن چلتی ہے۔ تب میرا حافظہ بھی اکبر کے نورتنوں والا تھا۔ مزاحیہ ڈائیلاگ، میں اسی لب و لہجے میں دُہراتی۔ یہ بات مجھے امّی سے ورثے میں ملی ہے۔ امّی بھی جس کی بات کرتیں، اسی کا لہجہ اختیار کر لیتیں۔

ooo

کتر بیونت

گھر پر مہمان داری بہت تھی۔ امی حتی الامکان سب کی خاطر داری کرتیں لیکن ابا جی کے بقول، مہمان کی توقعات ایک پولیس آفیسر سے بہت زیادہ ہوتیں جو کہ محض تنخواہ میں پوری کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے کچھ مہمان اس سے زیادہ خوش نہ ہوتے تھے۔ لیکن اکثر سمجھتے تھے کہ 'اوپر' کی آمدنی کے بغیر یہی کچھ ہوسکتا ہے۔

آپا اور دونوں بڑے بھائیوں کو اسی حساب سے ہاسٹلز کا خرچ ملتا۔ وہ نہ صرف اس میں گزارہ کرتے، بلکہ چھوٹے موٹے تحفے تحائف بھی گھر لے کر آتے۔ بڑے بھائی جان ایک اخبار میں پارٹ ٹائم کام کرتے۔ وہ میرے لیے کہانیوں کی کتابیں لاتے اور چھوٹے بھائی کے لیے کھیلوں کے میگزین۔ آپا میرے لیے فراک لاتیں جو وہ ہاسٹل کی مشین پر فارغ وقت میں سیتیں۔ ڈاکٹر بھائی پینٹنگ کے لیے کلرز اور کتابیں لے کر آتے۔ ایک دفعہ آپا نے اپنی بچت میں سے بڑے بھائی جان کو سویٹر بن کر دیا۔ اس کے جواب میں بھائی جان نے ایک خط آپا کو لکھا جس میں تھا کہ آپ نے ہر پھندے میں جو پیار باندھ کر یہ سویٹر تیار کیا ہے اس کی گرمی مجھے بہت عزیز ہے لیکن مجھے احساس ہے کہ آپ نے اسے بنانے کے لیے اپنے بجٹ میں بہت کتر بیونت کی ہوگی۔ یہ بات مجھے تکلیف دیتی ہے۔ آپا نے بتایا کہ خط پڑھ کر وہ تو روئیں سو روئیں۔۔۔ پورا ہاسٹل ہی آزردہ ہوگیا۔

منحوس ہندسہ

آپا کا ایم۔اے کا رزلٹ تیرہ تاریخ کو آیا۔ آپا خاندان کی پہلی لڑکی تھیں جنہوں نے ایم۔اے کیا تھا۔ سب بہت خوش تھے۔ ابا جی کہنے لگے:

''انگریز کہتے ہیں تیرہ کا ہندسہ منحوس ہے۔ لیکن میرے لیے تو بہت مبارک ہے۔ میری شادی تیرہ تاریخ کو ہوئی۔ ایک بیٹے (ڈاکٹر بھائی) اور ایک بیٹی (میں) کی تاریخ پیدائش تیرہ ہے اور اب بیٹی نے تیرہ تاریخ کو ایم۔اے کیا ہے۔''

ooo

احترامِ مذاہب

جب قرآن پاک کی اشاعت کرنے والی تاج کمپنی 'مرحومہ' نے جنم لیا تھا تو اس کے بانی حضرات نے ہندوستان کے مسلمانوں سے چندے کی اپیل کی تھی اور وہ اس پر ہر سال منافع دیتے تھے۔ ابا جی نے بھی تھوڑی سی رقم جمع کروائی تھی۔ منافع کی خاطر نہیں، اشاعت قرآن میں حصہ دار ہونے کے خیال سے۔ تاج کمپنی ہر سال بڑی باقاعدگی سے اس منافع کا واؤچر ابا جی کو بھجواتی۔ ابا جی نے یہ رقم کبھی روپے کی شکل میں نہیں لی تھی۔ وہ اس سے قرآن پاک یا پنج سورۃ کا کوئی نسخہ وہیں سے لے لیتے۔ میں چھوٹی تھی تو ابا جی ایک بار مجھے ساتھ لے گئے اور سارے منافع سے، مجھے وہیں سے کتابیں دلوادیں، جو تاج کمپنی، بچوں کے لیے چھاپتی تھی۔ یہ کتابیں قصص الانبیاء اور قصص القرآن پر مشتمل تھیں۔

ابا جی اکثر رات کو، ایسی ہی کہانیاں مجھے اور چھوٹے بھائی کو سنایا کرتے تھے۔ یہی نہیں، وہ تو ہندو مائیتھولوجی اور رامائن کے بارے میں بھی بتاتے تھے۔ میں تین سال ایک عیسائی مشنری سکول میں پڑھتی رہی ہوں۔ وہاں یہ اجازت تھی کہ مسلمان لڑکیاں چاہیں تو بائبل کی کلاس اٹینڈ نہ کریں، لیکن ابا جی نے مجھے یہ کلاس اٹینڈ کرنے کو کہا اور خود لاہور بائبل

سوسائٹی سے میرے لیے بائبل خرید کر لائے۔ ان کا کہنا تھا کہ سبھی مذاہب کے بارے میں جاننا چاہیے۔ اس سے ایمان کمزور ہرگز نہیں ہوتا اور نہ ہی ہونا چاہیے۔ ہمارے گھر میں گرنتھ صاحب کا بھی ایک نسخہ پڑا تھا جس کا پورا احترام کیا جاتا۔

ooo

عظمت کے مینار

ٹھیک سے یاد نہیں، سیارہ یا اردو ڈائجسٹ میں ایک سلسلہ 'عظمت کے مینار' آیا کرتا تھا۔ اس میں، ایک بار اباجی کے بارے میں کسی شخص نے لکھا،

"ایک ڈی۔ایس۔پی، اس نام کے، ملتان میں تعینات تھے۔ وہ میرے ڈیری فارم سے دودھ لیتے تھے۔ ان کا تبادلہ خانیوال ہو گیا۔ میرا بل، جو ان کی طرف واجب الادا تھا، انہوں نے خانیوال سے بذریعہ چیک بھیجا۔ ایسے ایماندار پولیس آفیسر میں نے کم ہی دیکھے ہیں۔"

یہ واقعہ اس شخص نے اباجی کے ریٹائر ہونے کے بارہ پندرہ سال بعد لکھا تھا۔ میں نے پڑھا تو اباجی کے پاس لے گئی۔ وہ پڑھ کر جذباتی ہو گئے۔ کہنے لگے،

"بیٹا۔۔۔ باہر تو لوگ میری تعریفیں کرتے ہیں کہ بہت ایماندار آفیسر ہے، لیکن یہ سب، آپ کی والدہ کی وجہ سے ہے۔ نہ انہوں نے مجھ سے بے جا فرمائشیں کیں نہ میں غلط کاموں پر مجبور ہوا۔ جیسے بھی ہوا تنخواہ میں گزارہ کیا۔ کبھی کوئی خواتین گھر میں آتیں اور 'بیگم صاحبہ' کو پوچھتیں تو آپ کی والدہ کو دیکھ کر حیران رہ جاتیں۔ جو سادہ ترین لباس میں گھر کے کاموں

میں مصروف ہوتیں۔"

کسی بیوی کی، اس کا شوہر اس سے زیادہ کیا تعریف کر سکتا ہے؟

گھر کے کاموں میں، یوں تو امی کے مددگار کافی ہوتے تھے۔ سستا زمانہ تھا۔ سرکاری افسر ہونے کی وجہ سے اباجی کو اردلی بھی ملا ہوا تھا لیکن وہ کبھی گھر کے اندر نہیں آتا تھا۔ امی پردہ کرتی تھیں۔ بہشتی کے آنے پر بھی وہ کمرے میں چلی جاتی تھیں۔ صفائی کے لیے عام طور پر کوئی عورت آتی تھی لیکن کچن کے کام میں مَیں نے نہیں دیکھا کہ جب تک وہ صحت مند رہیں انہوں نے کسی کی مدد لی ہو۔ گھر میں مہمانداری بھی بہت تھی۔ وہ خوشدلی سے سارے کام کرتیں۔ دودھ بلونے سے لے کر چپاتی بنانے تک۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت دیا تھا۔ کس کس چیز کا نام لوں۔ پلاؤ۔۔۔ کوفتے۔۔۔ ساگ۔۔۔ اور مکئی کی روٹی۔۔۔ پیار میں گندھے ہوئے مکھن میں کچور☆ پراٹھے۔۔۔ ابھی تک میرے ہاتھوں سے ان کی مہک آتی ہے۔ ان کے آخری ایام میں ڈاکٹر بھائی نے ان کو بہلانے کے خیال سے کہا،

"امی۔۔۔ کسی دن انڈوں کی بھجیا تو بنا کر کھلائیں۔"

اس پر وہ رو پڑیں۔ کہنے لگیں:

"بیٹا۔۔۔ اب تو میرے ہاتھوں میں طاقت نہیں۔۔۔ کیا کروں؟"

لیکن پھر حسبِ عادت انکار نہ کر سکیں۔ کہنے لگیں:

"اچھا میں پاس بیٹھ جاؤں گی۔۔۔ چمچہ تمہاری بہن ہلاتی جائے گی۔"

لیکن اس کا موقع نہ آیا۔

امی نے جتنے پیار سے کھانے بنائے۔۔۔ اتنے ہی اباجی ان کے معترف تھے۔ اس مقولے کے مطابق کہ

"کھانا بنانے پر صرف کیا جانے والا پیار، کبھی ضائع نہیں جاتا۔"

☆ یہ لفظ میری ذاتی لغت سے ہے، بمعنی گندھے ہوئے۔

شاید امّی کی محبت ان کھانوں کو لذیذ بنا دیتی تھی۔ میں نے اکثر عورتوں کو جلتے بھنتے، بیزاری سے کھانا بناتے دیکھا ہے۔ شاید تبھی ان کے کھانوں کی خوشبو اُڑ جاتی ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد، کبھی کبھار ابا جی بھی امّی کے کاموں میں ان کی مدد کروا دیتے تھے۔ ایک بار امی کپڑے دھو رہی تھیں۔ انہوں نے کپڑے نچوڑ کر بالٹی بھری اور خود کسی کام سے اندر چلی گئیں۔ واپس آئیں تو الگنی کپڑوں سے بھری دیکھ کر حیران ہوئیں۔ اتنے میں ابا جی ہنستے ہوئے آ گئے۔

"وہ کپڑے میں نے پھیلا دیے ہیں۔"

امّی کہنے لگیں:

"نا بابا۔۔۔ لوگ کہیں گے ریٹائر ہو کر یہ کام کرنے لگے ہیں۔"

بھابھی نے یہ دیکھ کر کہا:

"ابا جی آپ تو امّی کی مدد کرتے ہیں۔ اپنے بیٹے سے بھی کہیں، کبھی میری مدد کر دیا کریں۔"

ابا جی نے کہا:

"بیٹا۔۔۔ پہلے آپ اپنی ساس جتنا کام کر کے دکھائیں۔ اگر پھر میرے بیٹے نے آپ کی مدد نہیں کی تو میں اس سے کہہ دوں گا۔"

الیکٹرک ٹرالی اور مائیکروویو اوون تو آج کی بات ہیں لیکن میری ماں کے پاس تو اس زمانے میں بھی شاید یہ سب کچھ تھا۔ یاد نہیں کبھی ٹھنڈا کھانا، ملا ہو۔ جیسے ہی کوئی بچہ گھر آتا، توا رکھ کے ساتھ ساتھ گرم روٹی اُتارتیں۔

آج کل تو میڈیا کی بدولت کھانے کی ترکیبیں ہوا میں تیرتی پھرتی ہیں۔ امّی کے کھانوں میں تو تب بھی بہت تنوّع تھا۔ کبھی ابا جی سے پوچھتیں کہ آج کیا پکائیں تو وہ ایک عجیب سا جوڑ میل بتا دیتے۔ امّی کہتیں:

"لیں بھلا۔۔۔ یہ بھی کبھی پکتا ہے؟"

ابا جی ہنستے ہوئے کہتے:

"دیکھیے۔۔۔ یہ سب انسان کا ہی تو بنایا ہوا ہے، کوئی آسمانی صحیفہ تو ہے نہیں۔"

کھانا بنانے میں جو محنت درکار ہوتی ہے امّی نے اس میں کبھی خِسّت سے کام نہیں لیا تھا، وہ رات کو دودھ گرم کرتیں اور اسے پھینٹ پھینٹ کر اتنا ٹھنڈا کرتیں کہ وہ جمانے کے قابل ہو جائے۔ پھر اسے گجراتی مٹی کے بڑے سے پیالے میں دہی بنانے کے لئے ڈال دیتیں۔ بے حد مزے کا دہی تیار ہوتا۔ بڑے بھائی جان کے ایک دوست کہتے،

"اس پیالے میں تو چھ ماہ کے بچے کو با آسانی نہلایا جا سکتا ہے۔"

ooo

تحفے کی آڑ میں

ابا جی قصور میں تعینات تھے۔ ایک دن ان کے ایک جونیئر افسر، میرے لیے ایک سنہری پین تحفتاً لائے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک بوری بھر، سمگلنگ کے پین بارڈر سے پکڑے گئے ہیں، ان میں سے ایک بچّی کے لیے لے آیا ہوں۔ اب پین تو مجھے کیا ملنا تھا، ابا جی نے جو کہا وہ آفیسر بے چارے، مارے شرمندگی کے سر ڈالے سنتے رہے۔ مجھے وہ پین بہت خوبصورت لگا، لیکن لینا تو در کنار، اسے ہاتھ لگا کر بھی نہ دیکھ پائی۔

ابا جی بہاولنگر میں تھے، یہیں سے وہ ۱۹۶۵ء میں ریٹائر ہوئے۔ ہم لوگ فیصل آباد میں تھے۔ میں اور چھوٹے بھائی پڑھ رہے تھے اور ابا جی کی ریٹائرمنٹ کے بعد، ہمیں یہیں سیٹل ہونا تھا۔ بہاولنگر میں بھی بارڈر پر میٹنگ ہوتی تھی۔ انڈیا میں ابا جی کے ایک پرانے واقف کار کو جب معلوم ہوا کہ ابا جی وہاں Posted ہیں تو وہ ان سے ملنے آئے۔ ابا جی چھٹی پر فیصل آباد آئے تو انہوں نے مجھے مٹھی بھر، بہت عمدہ قسم کی الائچیاں اور کتھے چونے کی چوکور ڈلیاں دیں اور بتایا کہ یہ وہ صاحب لائے تھے، ساتھ میں چند ساڑھیاں تھیں جو کہ میں نے شکریے کے ساتھ واپس کر دیں اور باقی چیزوں میں سے یہ لے لیں۔ میں نے پوچھا:

”ابا جی ساڑھیاں کیسی تھیں؟“

کہنے لگے:

”میں نے نہیں دیکھیں“

میں نے کہا:

”آپ دیکھتے تو سہی۔۔۔“

وہ کہنے لگے:

”میں کیا کرتا دیکھ کر۔۔۔ لوگ تحفے کی آڑ میں، اپنے کام نکلواتے ہیں۔ چونکہ مجھے یہ چیزیں نہیں لینی تھیں اس لیے دیکھیں بھی نہیں۔“

ooo

محبتوں کی رنگولی

ایک بار میں امی کے لیے سوٹ خرید کر لائی اور ابا جی کو دکھایا۔ وہ کہنے لگے:

"بیٹا، دوپٹہ سفید ہی رکھیں، جو وقار سفید دوپٹے میں ہے وہ رنگ دار میں نہیں۔"

امی حتی الامکان، سفید دوپٹہ ہی اوڑھتیں۔ اس میں ان کے چہرے کی دمک پر، معصومیت کا رنگ غالب ہوتا۔

ایک بار ابا جی نے بتایا:

"پاکستان بننے سے پہلے ایک دفعہ میں آپ کی امی کے لیے سوٹ کا کپڑا لینے ایچ۔ کریم بخش لاہور گیا۔ وہ کپڑا امیمیں پہنتی تھیں۔۔۔ بہت خوبصورت تھا اور مجھے بہت پسند تھا لیکن اس کی قیمت ۳۵ روپے گز تھی اور میری کُل تنخواہ ۳۵ روپے تھے۔۔۔ سو میں واپس آ گیا یہ بات میں، آج آپ کو بتا رہا ہوں۔"

امی کی آنکھوں میں اس محبت کی چمک نظر آئی، جس کے تحت، ابا جی خریداری کرنے گئے تھے۔

محبتوں کی رنگولی اور چاہتوں کا چراغاں جیون رات کو سجائے رکھتا ہے۔

ooo

صوفہ تو بنوالیں۔۔۔

ہمارے ایک امیر رشتہ دار، ایک بار ہمارے ہاں آئے تو بڑی نخوت سے، ابا جی سے کہنے لگے:

"چوہدری صاحب۔۔۔ ایک آدھ صوفہ تو بنوالیں۔۔۔ یہ موڑھے کب تک چلیں گے؟"

ابا جی نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا:

"جب میری تنخواہ ڈیڑھ سو روپیہ تھی تو اچھا صوفہ، تب اتنے کا ہی بنتا تھا۔ آج بھی صوفے کی قیمت، میری ایک ماہ کی تنخواہ کے برابر ہے۔ اس لیے موڑھے ہی چلیں گے۔"

ooo

بلّے کھیر

بڑے بھائی جان کو کھیر بہت پسند تھی۔ امّی کے ہاتھ کی بنی ہوئی کھیر ہوتی بھی بہت مزے کی تھی۔ تھوڑے سے چاول اور ڈھیر سارا دودھ۔ ابا جی بھی اس کے بہت معترف تھے۔ ایک بار وہ کسی عزیز کے ہاں گئے۔ انہوں نے کھانے پر کھیر پیش کی۔ جس کی ترکیب، امّی کی بنائی ہوئی کھیر، کے بالکل اُلٹ تھی۔ یعنی زیادہ چاول اور تھوڑا سا دودھ۔ پھر بھی، صاحب خانہ ایک چمچہ کھیر کا، منہ میں رکھتے اور پکارتے۔

''بلّے کھیر''

ابا جی اس کھیر کو تو بمشکل، برداشت کر پائے لیکن وہ 'بلّے' ان کو کبھی بھول نہ سکی۔

نہ جانے یہ کیا بات تھی کہ جب بھی بھائی جان فرمائش پر کھیر بنواتے، وہ لگ جاتی۔ اس لیے امّی کوشش کرتیں کہ ان کے کہنے سے پہلے ہی کھیر بنالیں۔ وہ گھر آتے اور کھانے کی میز پر کھیر دیکھتے تو خوش ہو جاتے۔ محض اتّفاق کی بات ہے کہ ان کی زندگی کا آخری کھانا، بھی کھیر ہی تھا۔

ooo

امّی کی ڈگریاں

ہمارے گھر انگریزی اخبار 'پاکستان ٹائمز' آتا تھا۔ اتوار کو ناشتے کے بعد امّی اخبار دیکھنے لگتیں۔ ابا جی ہمیں اشارہ کرتے اور کہتے،

''دیکھیں، آپ کی امّی اخبار پڑھ رہی ہیں۔''

امّی بھی سنجیدہ منہ بنا کر کہتیں،

''سوچا ذرا خاص خاص خبریں دیکھ لوں''

ہم سب خوب ہنستے، پھر امّی کہتیں،

''میں چھوٹی کلاسوں میں بچوں کی مدد کرتی رہی ہوں، بعد میں ان سے مدد لیتی رہتی تو آج میرے پاس بھی کوئی ڈگری ہوتی۔''

ابا جی بڑے پیار سے ہماری طرف اشارہ کر کے کہتے،

''ان کی ڈگریاں آپ کی ہی تو ہیں۔''

یہ مکالمہ ہر اتوار دہرایا جاتا۔

ooo

بھائی کی پہلی کمائی

چھوٹے بھائی سیکنڈ ایئر میں تھے۔اس سال گرمیوں میں ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی۔ بہت سے لوگ بیمار ہوئے اور بہت سے چل بسے۔زرعی یونیورسٹی نے اپنے طلباء کی ڈیوٹی لگائی کہ دیہات میں جا کر لوگوں کی Vaccination کریں۔اس کا تھوڑا سا معاوضہ بھی دیا گیا۔بھائی بھی کافی دن مختلف علاقوں میں جاتے رہے۔امّی ان کے لیے بہت فکر مند رہتیں، کھانا ساتھ دیتیں اور پانی کی تھرمس بھی اور تاکید کرتیں کہ باہر سے کچھ نہیں کھانا۔جس دن بھائی کو Payment ملی (شاید 72 روپے تھی) وہ میرے لیے ایک شرٹ کا پیس لے کر آئے۔باقی روپے امّی کو دکھا کر اپنی جیب میں ڈال لئے تب خواتین میں سفید کاٹن کی شلوار پہننے کا رواج تھا ایک شرٹ بن جانے سے گویا ایک سوٹ بن جاتا۔

ooo

بی بی اور غریبی

ابا جی اونچا سنتے تھے۔اس لیے بولتے بھی اونچا تھے اور جب انہیں کسی بات پر غصہ آتا تو اور زیادہ اونچا بولتے اور میں دوسرے کمرے میں بیٹھی دہلتی رہتی۔بہت کم یا شاید کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے مجھ سے، اس طرح سے کچھ کہا ہو لیکن وہ گھر میں کسی سے بھی، اونچی آواز میں کچھ کہتے ـــ میں کانپنے لگتی۔بڑے بھائی جان کہتے جلے پاؤں والی بلّی کی طرح بھاگی پھرتی ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں آج بھی، اُونچی آواز سے اسی طرح خائف ہوں۔ اگر کوئی شخص با آوازِ بلند بولے تو میرا ڈرنا برحق ـــ میں تو سوچ کر بھی ڈر جاتی ہوں۔

ایک بار، باہر کے کام کے لیے ایک نوکر ہمارے گھر آیا۔وہ بھی بہرا تھا۔ابّا جی نے حسبِ عادت اس سے پوچھا:

''بھئی تم کون ہو؟''

(امّی نے آہستگی سے کہا ''بن گئے پولیس والے'')

اس کو، خدا خبر کیا سمجھ آیا۔کہنے لگا:

''کھانا کھالیا ہے۔بی بی جی نے دے دیا تھا۔''

اب ابا جی کو سننے میں مشکل ہوئی۔ اس نے کہا 'بی بی'۔۔۔ ابا جی سمجھے 'غریبی'۔ کہنے لگے:

''غریبی۔۔۔ امیری کا کیا سوال۔۔۔ تم کہلاتے کیا ہو؟''

امی بُڑبڑائیں ''لیجیے۔۔۔ نیا قضیہ شروع ہو گیا۔''

اور میں ہنسی کا فوارہ دبائے، ابا جی کو زور زور سے بتانے لگی۔ وہ بھی ہنسنے لگے۔

ooo

چاندرات

عید آتی تو واقعی خوشیاں لاتی۔ چاندرات کو، آپا ہم سب کے کپڑے استری کر کے رکھتیں۔ میں بار بار اُٹھ کر اپنی نئی جوتی میں پاؤں ڈالتی۔ پھر اسے ڈبے میں بند کر کے رکھ دیتی۔ امّی میرے ہاتھوں پر مہندی لگاتیں اور اُوپر سے پرانے کپڑے کے رومال بنا کر باندھ دیتیں تا کہ سوتے میں مہندی کھل نہ جائے، لیکن صبح سو کر اُٹھتی تو ہاتھ نہ جانے کب کے کھل چکے ہوتے۔ مہندی بکھرتے بکھرتے نارنجی رنگ چھوڑ جاتی۔ امّی میرے ہاتھوں پر تیل لگا کر، باقی ماندہ مہندی چھڑاتیں۔ سارا دن مہندی کی خوشبو مجھے مسحور کیے رکھتی۔

آپا گھر بھر کے کپڑے سیتیں۔ عید کے موقع پر بڑے بھائی مشین کے پیڈل چلا کر ان کی مدد کرتے اور اگر چاندرات تک سلائی مکمّل نہ ہوتی تو بٹن بھی ٹانک دیتے۔ کمرے میں ایک آدھ فالتو بلب کی روشنی۔۔۔ مشین کی کھٹ کھٹ۔۔۔ اور بہن بھائیوں کے قہقہے۔۔۔ امّی کوئی مزیدار سی چیز پکا کر لے آتیں۔ گھر کے اندر رہ کر اتنی خوبصورت چاندرات کا تصوّر، شاید فورٹریس اور لبرٹی میں چاندرات منانے والوں کے لیے سمجھنا مشکل ہو لیکن مجھے تو ہر عید اس کے سامنے پھیکی لگتی ہے۔

ابا جی رات کو جلدی سو جاتے۔ جب رات گہری ہو جاتی تو وہ بھی گھر میں شور شرابہ

دیکھ کر اُٹھ جاتے۔

"اوہو۔۔۔ ابھی تو سب جاگ رہے ہیں۔"

پھر آپا کو سلائی کرتے دیکھ کر ان کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے اور کہتے:

"بیٹا اپنا بھی کوئی سوٹ سیا ہے یا ملّاح کا حقہ سُکّا (خشک) ہی ہے؟"

جتنی تم پیار سے جی لو گے اتنی ہی زندگی۔۔۔

ایک عید پر آپا ہوسٹل میں ہی رہیں۔ عید کے فوراً بعد ان کا امتحان شروع ہونے والا تھا۔ باقی سہیلیوں کے فیصلے پر وہ بھی مجبور ہو گئیں لیکن وہ تو ہوسٹل میں روتی ہی رہیں۔ پڑھنا کیا خاک تھا؟۔۔۔ ہماری عید بھی روکھی پھیکی ہی گزری۔ میں نے رو رو کر آنکھیں سجا لیں۔ امّی مجھے خوش کرنے کے جتن کرتی رہیں۔ کہنے لگیں:

"لاؤ تمہارے ہاتھ پر مہندی سے پھول بنا دوں۔"

میں نے کہا:

"آپ میرے ہاتھ پر مہندی سے 'عید مبارک' لکھ دیں۔"

وہ کہنے لگیں:

"نیچے تم لکھ دو۔۔۔ اُوپر میں مہندی لگا دوں گی۔"

لیکن میرا دل، نہ بہلنا تھا نہ بہلا۔

محبت کے رشتے جتنے پیارے ہیں، اتنے ہی ظالم ہیں۔۔۔ آگ کا دریا ہیں۔۔۔ چڑھائی کا سفر ہیں۔۔۔ اماوس کی رات ہیں۔

بچپن میں میں امّی سے اکثر فرمائش کیا کرتی کہ پورے کمرے کے برابر ایک چار پائی بنوائیں اور اتنی ہی بڑی رضائی، تاکہ سب گھر والے اکٹھے سو سکیں۔ یہ فرمائش اس وقت کی جاتی جب رات کی محفل کے بعد سب اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لیے جاتے۔ مجھے رات میں سوتے ہوئے بھی الگ ہونا، شاق گزرتا۔

ooo

سری لنکا کے نقشے اور بغیر ہلدی کا سالن

ایف۔ایس۔سی کے بعد تک امّی اور آپا نے مجھے گھر کے کام کو ہاتھ تک نہ لگانے دیا۔ ابا جی کبھی دبی زبان میں کہتے بھی کہ کام کرنا آنا چاہیے۔ ضروری نہیں کہ کیا بھی جائے۔ تو امّی کہتیں:

"عمر پڑی ہے کام کرنے کو۔"

جن دنوں میں بی۔اے کی تیاری کر رہی تھی امّی کا بازو ٹوٹ گیا۔ آپا کی شادی ہو چکی تھی۔ میں نے گھر کا کام کرنا شروع کیا۔ عجیب تماشے کرتی۔ لیکن مجال ہے جو کسی نے مذاق اُڑایا ہو۔ ٹیڑھی میڑھی لیکن بہت پتلی روٹیاں بناتی تو ابا جی کہتے:

"اگر میں نے دو روٹیاں کھانا ہوں تو اڑھائی کھاتا ہوں۔"

چھوٹے بھائی کہتے:

"ویسے آپس کی بات ہے۔۔۔ یہ سری لنکا کے نقشے ہیں مزے کے۔"

بغیر ہلدی کا سالن کھا کر، ڈاکٹر بھائی اتنا سراہتے کہ میں نے گھر کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ آپا میکے آتیں اور مجھے بھاگ بھاگ کر کام کرتے دیکھتیں تو ان کا دل برا ہو جاتا۔ میں ان کے گلے میں جھول جاتی۔

"آپا۔۔۔ بڑا مزہ آتا ہے کام کرنے میں۔۔۔ سب اتنی تعریفیں جو کرتے ہیں۔"

دوزخ کے مزے

امی کو سردی بہت لگتی تھی۔ اب تو قدرتی گیس کے استعمال نے 'سردی مافیا' ختم کر دیا ہے لیکن تب وہ بہت دیر تک چولہے کے پاس بیٹھی رہتیں۔ سوتے وقت رضائی کے اوپر کمبل اوڑھتیں۔ ایک دن بہت سردی تھی، ہنس کر کہنے لگیں:

''آج کل دوزخ والے مزے میں ہوں گے۔''

پھر استغفار کرنے لگیں۔

شدید گرمیوں میں، چولہے کے پاس بیٹھنا بہت مشکل ہوتا، لیکن وہ کبھی بے دلی سے کھانا نہ بناتیں۔ ایک دن، تاؤ لگنے سے ان کی طبیعت خراب ہوگئی۔ جب بہتر ہوئیں تو کہنے لگیں:

''یہ سب، اماں حوّا کا کیا دھرا ہے ورنہ ہم آرام سے جنت میں پھل کھاتے۔ یہ چولہا چوکا تو نہ کرنا پڑتا۔''

ایک بار بیمار پڑیں تو مجھے کہنے لگیں۔

''ذرا چھ کلمے دہرانے میں میری مدد کرو۔''

ان کی طبیعت کافی خراب تھی۔ میں نے کہا:

''بہتر ہوں گی تو دہرا لیجیے گا۔''

خوب ہنسیں اور کہنے لگیں:

''تم کیا چاہتی ہو وہ 'گرز' لیے میرے پیچھے پھرتے رہیں۔''

OOO

Teeny Tiny اور Biggy Biggy

چھوٹے بھائی سے دوستی برابری والی تھی۔ بڑے بھائی جان اور ڈاکٹر بھائی سے بے تکلفی بہت تھی لیکن ذرا مختلف انداز لیے ہوئے تھی۔ بڑے بھائی جان پڑھاتے تو ڈکشنری مجھے نہ دیکھنا پڑتی۔ وہ مجھے بانسری کی لے پر 'سارے گاماپا' سکھاتے، ہم لفظوں کو اُلٹ پلٹ بولتے، چٹکیوں اور دھپّوں کی صورت میں ایک دوسرے کے لیے سزائیں مقرر کرتے۔ وہ بازوؤں سے پکڑ کر مجھے 'میری گوراؤنڈ' بنا دیتے۔

ڈاکٹر بھائی، ہمیشہ نظر رکھتے کہ کہیں میں سلیپر تو نہیں گھسیٹتی پھر رہی۔ بوٹ جرابیں پہنے ہوئے ہوں۔ بالوں میں خوش رنگ ربن بندھا ہے۔ کلرنگ بک میں جس صفحے میں رنگ بھرے ہیں اس کے برابر والی Poem یاد کی ہے یا نہیں؟ اس لیے میں انہیں بچوں کے لیے ایک کہانی کے کرداروں کے ناموں سے پکارتی بڑے بھائی جان Teeny Tiny اور ڈاکٹر بھائی جان Biggy Biggy۔ اور جب میں انہیں ہوسٹل میں خط لکھتی تو یہی القاب لکھتی۔

اپنے کالج کے زمانے میں بھائی جان انڈیا سے ہندی رسالہ 'پراگ' منگواتے تھے،

اس سے انہوں نے ہندی لکھنا سیکھی۔ مجھے بھی اپنا نام، ہندی رسم الخط میں لکھنا آ گیا۔ ایک دن ہمارے ایک ددھیالی عزیز آئے تو میں نے بڑے فخر سے انہیں لکھ کر دکھایا، وہ کہنے لگے:

''چھی چھی۔۔۔ ہندوؤں کی زبان۔۔۔''

ابا جی نے سنا تو کہنے لگے:

''اس میں کیا حرج ہے۔ دوسری زبانیں سیکھنی چاہئیں۔''

بڑے بھائی جان مجھے خط لکھتے:

''تمہارے پتر کا اُتر دے رہا ہوں آشا ہے تم کُشل ہو گی۔''

ooo

سگھڑاپا

امّی کچن کی صفائی اور کھانے کی اشیاء کی ستھرائی کا، بے حد خیال رکھتیں۔ گھر کے سارے پکے برتن، سال میں دو بار قلعی کروائے جاتے۔ قلعی گر، گھر پر آتا اور سارا دن صرف کر کے برتن قلعی کرتا۔ میں سکول سے واپس آکر، اس کے پاس بیٹھی، برتن قلعی ہوتے دیکھتی رہتی۔ وہ ایک چھوٹی سی بھٹی بنا کر اس میں کوئلے دہکاتا۔ پھر چمڑے کی پھکنی کے ساتھ اس میں ہوا بھرتا تو آگ تیزی سے جلنے لگتی۔ گرم برتن پر قلعی لگا کر روئی کی گدّی پھیرتا تو برتن جھمجھما اُٹھتا۔ پیتل کے سنہری، تانبے کے سرخ اور قلعی شدہ روپہلی برتن، باورچی خانے کی رونق میں اضافہ کرتے۔

سال بھر کی گندم اکٹھی خرید لی جاتی۔ امّی ہر ماہ ضرورت کے مطابق اسے دھو کر سکھاتیں۔ صحن میں چارپائیوں پر چادریں بچھا کر، ان پر گندم ڈال دی جاتی۔ امّی آتے جاتے اس میں ہاتھ پھیرتی جاتیں۔ میں بھی کبھی ان کا ساتھ دیتی تو گندم میں سے اٹھتی نمی والی خوشبو مجھے بہت اچھی لگتی۔ مرچ مصالحے بھی، امّی گھر پر ہی کوٹ چھان کر تیار کرتیں۔ نمک کے بڑے بڑے ٹکڑے دھو کر خشک کرتیں اور ہاون دستے سے کوٹ لیتیں۔ ان کے پاس ایک

چھوٹی سی چکّی بھی تھی اس میں نمک پیس کر ایک برتن میں بھر لیتیں، جو کافی عرصہ استعمال ہوتا۔ ہر ہنڈیا کے لیے تازہ مصالحہ پیستیں۔ آج کل وقت کی کمی، سہل پسندی یا صاف ستھری اشیاء کی دستیابی الگ چیز لیکن ماننے والی بات یہ ہے کہ اس ہنڈیا کا مزہ ہی الگ ہوتا۔

ooo

خلیج

ابا جی ریٹائر ہوئے تو میری اور چھوٹے بھائی کی تعلیم ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ آپا اور بڑے بھائیوں کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی اور ہمارا اپنا کوئی گھر بھی نہیں تھا۔ ظاہر ہے ابا جی کی تنخواہ میں سب تعلیم حاصل کر رہے تھے، یہی بڑی بات تھی۔ ڈاکٹر بھائی نے ان حالات کو دیکھتے ہوئے خلیج کے ایک ملک میں سروس کر لی۔ جس سے گھر میں فراوانی تو بہت ہو گئی لیکن، ہم سب ان کی کمی کو بہت محسوس کرتے۔ انہوں نے بھی اپنا Contract پورا نہ کیا اور جلد واپس آ گئے۔ وہ گھر کے لیے اور چیزوں کے علاوہ فریج لے آئے جو اس زمانے میں بہت عام نہیں تھا۔

میں نے اور چھوٹے بھائی نے فریج Un pack کیا، صاف کیا اور امی کو بٹن دبا کر افتتاح کرنے کو کہا، سب نے تالیاں بجائیں۔ امی ایک ایک چیز اس میں رکھتیں اور شکر شکر کرتیں۔

فوٹوگرافی، میرے سوا سب بہن بھائیوں کا شوق تھا۔ ہمارے پاس بہت اچھا کیمرہ نہیں تھا، لیکن بڑے بھائی جان نے اس سے بہت عمدہ تصویریں بنائیں۔ انہیں Develop

بھی وہ خود ہی کرتے تھے۔ آپا نے پنجاب یونیورسٹی کے فوٹوگرافی کے مقابلے میں اوّل انعام بھی حاصل کیا تھا۔

جب ڈاکٹر بھائی باہر گئے تو بڑا اچھا کیمرہ انلارجر، اور فوٹوگرافی کا دیگر سامان لے کر آئے۔ گھر میں ایک ڈارک روم بنایا گیا تھا۔ بھائی جان پورٹریٹ بناتے، اسے انلارج کرتے اور یوں ان کے شوق کو بڑھاوا ملا۔

ooo

Independent PEN

ابا جی ہمیشہ پارکر کا پین استعمال کرتے۔ میرا خیال ہے اپنی ذات پر کیا جانے والا، یہ ان کا واحد بڑا خرچ تھا۔ اس کے لیے بھی وہ ہمیشہ معذرت خواہ نظر آتے۔ کہتے،

''میں بہت دبا کر لکھتا ہوں اور کوئی دوسرا پین اس کا متحمل نہیں ہوتا۔''

پین کو وہ ہمیشہ Independent کہتے۔ ڈاکٹر بھائی باہر گئے تو ان کے لیے زیادہ قیمتی پارکر پین لے کر آئے۔ اسے وہ بہت سنبھال کر رکھتے۔ پھر کسی ایک دن وہ اچانک 'انکشاف' کرتے کہ ان کا پین کھو چکا ہے۔ سارا گھر اس کو تلاش کرنے میں مصروف ہو جاتا۔ کچھ دیر بعد وہ مسکراتے ہوئے چلے آتے۔

''لو بھئی۔۔۔ وہ تو میری جیب میں لگا ہے۔ میں نے سوئیٹر پہن رکھا تھا پتا ہی نہیں چلا۔''

سب سکھ کا سانس لیتے۔ امی کہتیں،

''پین اور وہ بھی بیٹے کا لایا ہوا۔۔۔ خدا کے لیے اسے سنبھال کر رکھا کریں۔ آپ تو مجھے پریشان کر دیتے ہیں۔''

ooo

حُسن پری

بڑے بھائی جان کیمرے سے بڑے اچھے پورٹریٹ بناتے تھے۔ کبھی وہ مجھے کہتے کہ آؤ تمہاری تصویر بناؤں اور میرا موڈ نہ ہوتا تو میں کہتی،

''نا۔۔۔ بابا۔۔۔ مجھے تصویر نہیں بنوانی۔۔۔ میری تصویر اچھی نہیں آتی۔۔۔''

تو چھوٹے بھائی، جھٹ سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر گلوگیر آواز میں کہتے۔

''صبر کرو میری عزیز بہن۔۔۔ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ تصویر ویسی ہی بنتی ہے، جیسی شکل ہو۔''

اور میں اپنا موڈ بھول کر کیمرے کے سامنے جا بیٹھی۔

''میں تصویر بنوانے لگی ہوں۔۔۔ اور آپ دیکھ لیجیے گا۔ کتنی اچھی آتی ہے۔۔۔ ہاں۔''

ایک بار میں نے چھوٹے بھائی کی تصویر بنائی اور انہوں نے میری۔ اتفاق سے دونوں بہت اچھی بنیں۔ میں ہر ایک کو دکھاتی اور بھائی کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہتی:

''یہ تصویر کھینچنے والے کا کمال ہے۔''

اور پھر اپنی تصویر کی طرف دیکھ کر کہتی:

''یہ تصویر کھینچوانے والے کا۔''

بھائی جواب میں ایک لمبی سی 'ہوں' کرتے۔

ابا جی کے ریٹائر ہونے پر ہمارا اپنا گھر نہیں تھا۔ ڈاکٹر بھائی نے خلیج کے ایک ملک میں سروس جوائن کر لی تو گھر بنانے کا سوچا گیا۔ ہماری زرعی زمین بھی شہر کے نزدیک تھی، وہیں پر، چھ کنال کے قطعہ پر گھر بنایا۔ اس کے اندر نہری پانی کا ایک نالہ تھا، جس سے گھر سے ملحقہ باغ میں پانی دیا جاتا۔

ایک دن میں نے کہا:

''افسوس کہ پانی 'شفاف' نہیں ہے ورنہ میں اپنے 'مرمریں پاؤں' اس میں لٹکا کر بیٹھا کرتی۔''

چھوٹے بھائی جھٹ سے بولے:

''جیسے تمہارے پاؤں 'مرمریں' ہیں ویسا 'شفاف' تو یہ ہے۔''

OOO

عیاشی

میں ہائی سکول میں پڑھ رہی تھی۔ ابا جی ریٹائر ہو گئے تھے بڑے بھائی جان سروس میں آ چکے تھے۔ انہیں کمپنی کی طرف سے گاڑی بھی مل گئی تھی۔ رات کو امی کام سے فارغ ہو جاتیں تو بھائی جان کہتے،

''چلیں۔۔۔ تھوڑا گھوم آئیں۔''

ہم گاڑی میں بیٹھتے۔۔۔ گھنٹہ گھر تک آتے، ایک کولڈ ڈرنک پیتے یا آئس کریم کھاتے اور واپس۔۔۔ صبح کے ناشتے کے لیے کوئی چیز لینا ہوتی تو وہ بھی لے لیتے۔ یہ ہماری 'عیاشی' کی انتہا تھی۔ اس زمانے میں گھر سے باہر نکلنا اور وہ بھی اپنی گاڑی میں۔۔۔ بڑی بات تھی۔

ابا جی جلد سونے کے عادی تھے۔ وہ گھر پر رہتے، صبح امی انہیں بتاتیں تو ابا جی کہتے۔

''اچھا ہے سارا دن آپ کام میں مصروف رہتی ہیں۔ تھوڑی 'ہوا بدلی' ہو جاتی ہے۔''

امی ہاتھ باندھ کر، آنکھیں بند کر کے دل کی گہرائی سے، اللہ کا شکر ادا کرتیں۔

پھر بھائی جان نے مجھے ڈرائیونگ سکھانا شروع کی۔ شروع میں، تو مَیں بہت گھبراتی لیکن جلد ہی بہتر ہو گئی۔ ایک دن بھائی جان دوپہر میں سو رہے تھے، میں اکیلے

گاڑی لے کر نکلی، تھوڑی دُور تک گئی، پھر واپس ہوئی۔ واپسی پر ایک کتّے کا پِلّا گاڑی کے پہیے کے نیچے آ کر مر گیا۔ کہاں تو میں اس ارادے سے نکلی تھی کہ بھائی جان کو بتاؤں گی کہ میں نے کتنا بڑا معرکہ سَر کیا ہے اور کہاں گھبرائی ہوئی، ڈرتی کانپتی گھر واپس آئی اور بھائی جان کو سوتے سے جگا کر اعلان کر دیا کہ آئندہ ہرگز ہرگز گاڑی نہیں چلاؤں گی۔

بھائی جان مجھے سمجھانے لگے۔

''بیٹا یہ تو پلّا تھا۔۔۔ بے چارہ 'کتّے کی موت مر گیا' خدانخواستہ کوئی بڑا حادثہ بھی ہو سکتا تھا، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ دنیا کے کام ہی چھوڑ دیے جائیں۔ چلو۔۔۔ ابھی دوبارہ گاڑی چلاؤ۔ میں ساتھ چلتا ہوں۔''

ہم لوگ کافی دیر گھومتے رہے۔ واپس آئے تو بھائی جان کہنے لگا۔

''ایئر فورس میں کوئی حادثہ ہو جائے تو باقی پائلٹوں کو اسی وقت جہاز چلانے کو کہا جاتا ہے تاکہ ان کے دل میں ڈر نہ بیٹھ جائے۔ تمہارا ابھی اس وقت گاڑی چلانے بہت ضروری تھا۔ ورنہ تم میں مستقل جھجک آ جاتی۔''

اس کے بعد تو میں نے موٹر سائیکل بھی چلانا سیکھی۔

ایک بار میں اکیلی گاڑی لے کر گئی۔ ان دنوں شہر میں ٹریفک سگنل تو ہوتے نہیں تھے۔ سپاہی ٹریفک کنٹرول کر رہا تھا۔ میں نے دھیان نہیں دیا اور نکلتی چلی گئی۔ تھوڑی دور جا کر ایک دکان پر گاڑی روکی، دیکھا تو سپاہی بے چارہ پسینے میں شرابور ہانپتا کانپتا، سائیکل پر چلا آ رہا ہے۔ کہنے لگا:

''آپ غلط گاڑی نکال کر لائی ہیں۔ میں سیٹیاں بجاتا رہا، آپ نے دھیان ہی نہیں دیا۔''

میں نے جھٹ سے کہا:

''آپ لڑکیوں کو دیکھ کر سیٹیاں بجاتے ہیں؟ کتنی بری بات ہے۔''

بھلے زمانے تھے، بے چارہ ہنستا ہوا واپس چلا گیا۔ میں نے بھائی جان کو بتایا تو وہ بہت ہنسے اور کہنے لگے:

''غلط گاڑی چلانا خطرناک ہے۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ اگر کہیں کچھ ایسا ہو کہ تمہیں سمجھ نہ آئے تو گاڑی روک دیا کرو اور بیٹھ کر 'دانت نکالتی' رہا کرو (میں موقعہ، بے موقعہ ہنسا جو کرتی تھی) شہر میں اکّا دُکّا خاتون گاڑی چلاتی ہے (بلکہ شاید کوئی بھی نہیں) لوگ خیال کرتے ہیں گھبرایا نہ کرو۔''

○○○

اصل زر اور سود

ابا جی ہمارے لیے ایک سخت گیر والد تھے، لیکن اولاد کی اولاد کے لیے بریشم کی طرح نرم۔ ویسے تو میں، جو بچوں میں سب سے چھوٹی تھی، کے ساتھ ہی ان کے رویّے میں، بڑے بہن بھائیوں کی نسبت بہت تبدیلی آ گئی تھی۔ میں سکول میں ہونے والے ڈراموں اور لڈّی وغیرہ میں جو حصّہ لیتی، وہ گھر پر ان کے سامنے دہراتی اور امّی حیران رہ جاتیں۔ ایک بار میری سب سے بڑی، تین سالہ بھتیجی نے کہا:

ابا جی۔۔۔تالی بجائیں۔"

وہ تالی بجانے لگے پھر بولی:

"ابا جی گانا گائیں۔"

وہ قوالّی کے انداز میں آ آ۔۔۔کرنے لگے۔ بچّی نے پھر کہا:

"ابا جی۔۔۔ڈانس کریں۔"

اس پر وہ ہنس کر کہنے لگے:

"بھئی بیٹا۔۔۔اب یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

پھر خوب ہنسے اور کہنے لگے:

"میں تو بچوں کو کبھی اُلٹے سیدھے منہ تک نہیں بنانے دیتا تھا اور اب۔۔۔واقعی اصل زر سے سود زیادہ پیارا ہے۔"

ooo

شرارت

ایک بار میں میکے آئی تو چند روز رہنے کے بعد، اگلی صبح مجھے واپس جانا تھا۔ میں تیاری کر رہی تھی۔ میں نے امّی سے کہا کہ ابا جی کو بتا دیں کہ میں صبح واپس جا رہی ہوں۔ وہ کہنے لگیں۔

''تم خود ہی بتا دو۔''

میں نے ابا جی کو بتایا تو وہ ہنس کر کہنے لگے:

''اچھا۔۔۔ بیٹا۔۔۔ 'چھٹی' ختم ہو گئی۔''

اس پر امّی ہنس کر کہنے لگیں۔

''کیا زمانہ آ گیا ہے۔۔۔ ہمارے زمانے میں تو بیٹیاں کبھی اپنے باپ کو خود نہیں بتاتی تھیں کہ وہ سسرال جا رہی ہیں۔''

اور میں امّی کی اس 'شرارت' پر جھینپ گئی۔

ooo

محبت کی مہک

بہت سویرے آنکھ کھلتی تو ابا جی چلتے پھرتے، اُونچی آواز میں سورۃ یاسین اور سورۃ رحمٰن پڑھتے سنائی دیتے۔ میں گرم بستر میں لیٹی ان کی دل میں اتر جانے والی آواز، سنتے سنتے پھر سو جاتی۔ جب سکول جانا شروع کیا تو ابا جی:

؎ سویرے جو کل آنکھ میری کھلی
عجب تھی بہار اور عجب سیر تھی

سنا کر جگاتے یا کبھی Early to bed and early to rise۔

کسی روز ابا جی دیر تک قرآن پاک پڑھ رہے ہوتے اور میری آنکھ کھل جاتی تو میں اچھل کر بستر سے نکلتی اور انہیں قرآن پاک کا پہلا صفحہ کھول کر دکھانے کو کہتی۔ اس پر گلابی رنگ کے گلاب کے پھولوں کا بہت خوبصورت حاشیہ تھا۔ میں وہ دیر تک دیکھتی رہتی۔ مجھے کپڑوں میں بھی ویسے ہی گلاب کے پھولوں والے پرنٹ بہت اچھے لگتے ہیں۔

صبح میں سو کر اُٹھتی تو مجھے اپنے سرہانے پھول پڑے نظر آتے یا گھر میں لگے ہوئے پھل دار پودے کا تازہ پھل۔ جو ابا جی توڑ کر وہاں رکھ دیتے۔ یہ ان کی زندگی تک ہوتا رہا۔ میں میکے آتی تو پھولوں کی خوشبو اور محبت کی مہک سے سرشار اُٹھتی۔

ہارٹ اٹیک

۵جنوری۱۹۷۴ء کی سرد رات ۔۔۔ سہمی ہوئی فضا ۔۔۔ مکمل خاموشی ۔۔۔ سب یوں دبے پاؤں چل پھر رہے تھے، جیسے سائے ہوں ۔۔۔ ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے تکتے ہوئے ۔۔۔ بڑے بھائی جان کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ ان کے کمرے میں ڈاکٹر بھائی اور ان کے ایک ڈاکٹر دوست موجود تھے۔

بھائی جان کو آکسیجن دی جا رہی تھی۔ ان کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کی بوندیں، چمک رہی تھیں۔ وہ زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑے تھے اور ساتھ کے کمرے میں امی ابا جی بیٹھے تھے۔ وہ سراپا دعا تھے۔ ذرا سی آہٹ سے، وہ یوں دہل جاتے کہ اب نہ جانے کیا سننے کو ملے گا؟ آپا ان کو سنبھالنے میں لگی ہوئی تھیں۔ میں اور چھوٹے بھائی ٹھنڈے فرش پر، ننگے پاؤں چھوٹے موٹے کام کرتے پھر رہے تھے۔ صورتِ حال کی سنگینی، میرے منہ سے سسکی کی صورت میں نکلتی تو، چھوٹے بھائی میری طرف دیکھ کر، منہ پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش ہونے کو کہتے۔ ایسے میں ان کی بڑی بڑی آنکھیں، سرخ ہو جاتیں۔ رات اسی بیم و رجا میں کٹی۔ صبح بھائی جان کی طبیعت قدرے سنبھلی لیکن ۷۲ گھنٹے تلوار سر پر لٹکتی رہی۔

وہ آہستہ آہستہ بہتر ہونے لگے امی۔ ابا جی کی دعائیں اور ڈاکٹر بھائی کی شبانہ روز محنت رنگ لائی۔ ڈاکٹر بھائی نے دو ماہ اپنے کلینک کا رُخ نہیں کیا۔ ان کے ڈاکٹر دوست بھی پہلے ۳۶ گھنٹے ہمارے گھر پر رہے اور پھر باقاعدگی سے روزانہ آتے رہے (آج کسی ڈاکٹر کو بتایا جائے تو شاید وہ یقین نہ کرے لیکن ہمارے معاملات کچھ ایسے ہی ہیں۔ زندگی میں روپے پیسے کو اتنی ہی اہمیت دی، جتنی کہ دی جانی چاہیے۔ محبتوں کو کبھی اس کے برابر نہیں تولا۔)

اس کے ٹھیک دس ماہ بعد امی کو بھی ہارٹ اٹیک ہوا۔ جس کے لیے وہ کہتیں،

''یہ بیماری میں نے مانگ کر لی ہے۔''

اس کے جواب میں، ابا جی اکبر بادشاہ کے اپنے بیٹے کے لیے سات پھیروں کی کہانی سناتے۔

اور پھر اس کے دس سال بعد بڑے بھائی جان اور امی، اسی طرح پانچ ماہ بیس دن کے وقفے سے، اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

؎ پِیڑ ہے نی پِیڑے
ایہہ پیار ایسی تتلی ہے
جیہڑی سدا سُول تے بہوے

(شوکمار بٹالوی)

ooo

عالمِ ہستی کی ویرانی

۱۸؍اگست ۱۹۸۱ء۔۔۔ پورنماشی کی رات۔۔۔ ایک بجے کا عمل۔۔۔ ہر چیز نے چاندنی کی سفید چادر اوڑھ رکھی تھی۔ میں امّی کے پاس گہری نیند سو رہی تھی کہ ایک کار آ کر رُکی۔ ڈرائیونگ سیٹ سے نکلنے والے نے دروازہ کھلا ہی رہنے دیا۔ کار کی بتیّاں، اسی طرح جل رہی تھیں۔ اباجی باہر والے برآمدے میں سو رہے تھے۔ آنے والے ڈاکٹر بھائی تھے۔ وہ اباجی کے پاس دوزانو ہو گئے اور سر ان کے سینے پر رکھ دیا۔ اباجی کی آنکھ کھلی تو انہوں نے حیران نظروں سے دیکھا، پھر ایک دم گھبرا کر اُٹھ گئے۔

''بیٹا کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟''

ڈاکٹر بھائی نے جواب دیا!

''نہیں اباجی، خیریت ہی تو نہیں ہے۔''

''اللہ رحم کرے۔''

''اباجی۔۔۔ صفدر (چھوٹے بھائی)۔۔۔ چلا گیا۔''

''اِناللہ۔۔۔''

آپا اور بھابھی جاگ رہی تھیں۔ انہیں بھی پتا چل گیا، کیونکہ تھوڑی ہی دیر پہلے، تو

چھوٹے بھائی کی طبیعت خراب ہو جانے پر، بڑے بھائی جان انہیں ڈاکٹر بھائی کے پاس لے گئے تھے۔ مجھے جگا کر ڈاکٹر بھائی باہر لے آئے اور کہا:

''صفدر چلا گیا۔''

میں گہری نیند میں تھی اور یوں بھی یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی۔

''ڈاکٹر بھائی۔۔۔ کہاں؟''

ڈاکٹر بھائی کے پاس، اس کا جو جواب تھا، وہ ہمارے خاندان کی تباہی کا آغاز تھا۔

اب امّی کو بتانا باقی تھا، جو دوا کے زیرِاثر سو رہی تھیں۔ ڈاکٹر بھائی کے ڈاکٹر دوست ساتھ آئے تھے۔ امّی کو جگا کر، ڈاکٹر صاحب انہیں انجکشن دینے لگے تو امّی نے پوچھا۔

''مجھے انجکشن کیوں دے رہے ہیں؟''

ڈاکٹر صاحب کے پاس آپا کھڑی تھیں، انہوں نے کہا،

''امّی۔۔۔ صفدر بیمار ہے۔''

امّی کہنے لگیں!

''ڈاکٹر صاحب۔۔۔ بیٹا۔۔۔ اسے دوا دیں۔۔۔ مجھے انجکشن کیوں دے رہے ہیں؟''

تھوڑی دیر کے بعد ایمبولینس آ گئی۔ بڑے بھائی جان آگے بیٹھے تھے اور پیچھے۔۔۔

چھوٹے بھائی کو دو ماہ میں تیسرا ہارٹ اٹیک ہوا، جو جان لیوا ثابت ہوا۔ دُنیا سے رخصت ہونے کے بعد بھی، ان کے چہرے پر وہی مسکراہٹ منجمد تھی، جو ان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ گھر میں کون زیادہ دکھی تھا؟۔۔۔ اندازہ لگانا مشکل تھا۔

اس سانحے سے، ہمارے گھر کا نقشہ بدل گیا۔ خوشیوں کی جگہ، دکھ بھر گئے۔ قہقہوں نے سسکیوں کا روپ، دھارن کر لیا۔ وہ دن اور آج کا دن، عالمِ ہستی کی ویرانی نہیں جاتی۔

☆ بہار راچہ می کنم چُوشد زبر بہارِ من

☆ میں بہار کا کیا کروں جب میری بہار مجھ سے جدا ہو گئی۔

شہرِ خموشاں آباد ہو گیا

گھر سے ملحقہ زمین میں، چھوٹے بھائی کی قبر بنانے کو ابا جی نے ہی کہا تھا۔ عزیزوں نے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی کہ قبر اتنی نزدیک نہ بنائی جائے، لیکن ابا جی دکھ کی جس کیفیت میں سے گزر رہے تھے، انہیں منانا، ناممکن تھا۔ انہیں قائل کرنے کو کہا کہ اکیلی قبر نہیں بنانا چاہیے۔ انہوں نے جواب دیا،

"آپ لوگوں کا کیا خیال ہے یہ اکیلی رہ جائے گی؟"

اور پھر سب سے پہلے چھوٹے بھائی کے پہلو میں، جا آباد ہوئے۔ اڑھائی سال کے اندر اندر بڑے بھائی جان اور امی بھی وہیں جا سوئے، اور وہاں ایک الگ شہرِ خموشاں آباد ہو گیا۔

چھوٹے بھائی اور ابا جی کے جانے سے، گھر کے دو کمانے والے جاتے رہے تو ڈاکٹر بھائی کو فکرِ معاش نے، زیادہ مصروف کر دیا۔ ساتھ میں امی کی بیماری۔۔۔ بڑے بھائی جان بھی دِل کے مریض تھے۔

بڑے بھائی جان نے گھر کے دیگر معاملات سنبھال لیے۔ امی کی طبیعت دن میں

کئی کئی بار خراب ہوتی، بڑے بھائی جان ہمہ وقت ان کے ساتھ رہتے۔۔۔ دکھ، پریشانیاں۔۔۔ مسائل۔

ابا جی کی وفات کے دو سال بعد جب گھریلو زندگی قدرے معمول پر آنے لگی تو امی بھی تمام تر پریشانیوں کے باوجود کہتیں۔

"خدا سب کے ساتھ مجھے بھی زندگی دے۔۔۔ اتنی کہ بِن باپ کے بچے، ذرا بڑے ہو جائیں۔"

کہ بڑے بھائی جان بھی رات کو سوتے سوتے میں، گزر گئے۔ ان کی ڈائری میں یہ شعر لکھا ہوا ملا۔

تھک کر یونہی دم بھر کے لیے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اُٹھیں، یہ ارادہ تو نہیں تھا

دکھ کی اگر کوئی شکل ہوتی ہے تو وہ میری ماں سے مشابہت رکھتی تھی۔ وہ رضائی میں منہ چھپا کر روتیں اور پھر منہ صاف کر کے کہتیں:

"آج سردی بہت ہے رضائی گرم ہی نہیں ہو رہی۔"

ایک دن امی نے ایسے ہی رضائی منہ سے اُتار کر مجھ سے کہا:

"بیٹا۔۔۔ مجھے اصغر (بڑے بھائی جان) کا تمہارے باپ جیسا آسرا تھا۔"

ہمارے معاشرے میں عورت کے لیے شوہر اور بڑا بیٹا کیا حیثیت رکھتے ہیں، اس ایک جملے سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

ooo

ماہِ شبِ چار دھم

چھوٹے بھائی کی وفات کے دس ماہ بعد ابا جی بھی چل بسے۔

تم ماہِ شبِ چار دھم تھے میرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا، گھر کا وہ نقشہ کوئی دِن اور
(غالبؔ)

ابا جی بلا ناغہ بھابھی کو پاس بٹھاتے اور کہتے!

"بیٹا جوانی میں بیوگی، بہت بڑی مصیبت ہے۔ مگر تم اکیلی نہیں ہو۔ ہم سب مِل کر اس مصیبت کو ڈھا دیں گے۔"

لیکن سب سے پہلے خود ڈھے گئے چھوٹے بھائی کی وفات پر لوگ کہتے:
"بنیاد کی اینٹ ہل گئی ہے۔" اور وہی ہوا۔۔۔ عمارت کمزور ہو گئی۔

ooo

تنگ دستی

۱۶ ستمبر ۱۹۸۴ء۔۔۔ بڑے بھائی جان کی وفات کا دن۔۔۔ مجھے ادھورا کر گیا۔ یوں لگتا ہے جیسے Jig-Saw Puzzle میں، میری تصویر کا ایک ایسا ٹکڑا گم ہو گیا ہے جس سے مَیں، مَیں نہیں رہی، ہمہ وقت نامکمل ہونے کا احساس، میری شخصیت میں دَر آیا ہے۔ ہر دن کا آغاز اور ہر رات کی انتہا۔۔۔ ہر کام میں۔۔۔ ہر بات میں۔۔۔ ہر سوچ میں، ہر راہ میں۔۔۔ احساسِ محرومی کا خلا۔ وہ گنجِ گراں مایہ کھو گیا تو تنگ دستی نے ڈیرے ڈال دیے۔

دکھن میرے
نیناں دے کوئے
وچ ہڑ ہنجواں دا آیا
(شِوکمار بٹالوی)

ooo

داڑھی میں کُھجلی

چھوٹے بھائی کی وفات کے دس ماہ بعد، ابا جی بھی وفات پا گئے۔ اپنی وفات سے دو ماہ قبل، انہوں نے داڑھی رکھ لی۔ ایک دن امّی سے کہنے لگے۔

''داڑھی رکھنے سے میرے چہرے پر کُھجلی بہت ہوتی ہے۔ کیا یہ اسی طرح ہوا کرتی ہے؟''

امّی نے تمام تر دکھ کے باوجود، اپنی رَو میں کہا،

''نہیں۔۔۔ جب میں نے داڑھی رکھی تھی تب تو نہیں ہوتی تھی''

ابا جی نے سٹپٹا کر کہا،

''او ربّا میریا۔۔۔ آپ سے کوئی بات کیا کرے؟''

ooo

ویرانے پر کیا گزری

شدید سردی ہے۔۔۔ پندرہ دن سے سورج نظر نہیں آیا، گزرتے دن کے ساتھ ساتھ، دھند چھٹنے کی بجائے اور گہری ہوتی جاتی ہے۔ مجھے ایسا موسم، بہت خوبصورت لیکن بہت اداس لگتا ہے۔ دل خوش ہو تو موسم کی خوبصورتی، اداسی پر غالب آ جاتی ہے لیکن اگر اندر بھی دھند ہی چھائی ہو تو پھر یہ دو چند ہوتی ہوئی دھند، مجھے مغلوب کر لیتی ہے۔

آنکھ کہتی ہے ''باہر بہت دُھند ہے''

دل یہ کہتا ہے ''اندر بھی کم تو نہیں'' (امجد اسلام امجدؔ)

دھندلی دھندلی۔۔۔ سیلی سیلی یادیں آنکھوں کو نم کر دیتی ہیں۔

میں نے ہمیشہ خود کو Under Estimate کیا ہے۔ میں سمجھتی رہی کہ میں بہت کم ہمت ہوں۔ چھوٹا سا دکھ۔۔۔ چھوٹی سی پریشانی برداشت نہیں کر سکتی، لیکن میں کس حوصلے کی مالک ہوں؟ یہ تو وقت نے مجھ پر واضح کیا۔ وقت استاد ہے۔۔۔ وقت مرہم ہے اور وقت آئینہ ہے، جو وہ کچھ آشکار کر دیتا ہے جس کا عکس تک، ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا۔ میرے بڑے بھائی جان مجھ سے جدا ہوئے، وہ بھائی جو میرا بھائی تو تھا ہی میرا باپ، میرا دوست،

میرا غمگسار بھی تھا۔۔۔ کسی موضوع پر بات ہو رہی ہو، مجھے بھائی جان کی کہی ہوئی کوئی بات یاد آتی ہے۔ کیا ہم ہر موضوع پر بات کرتے تھے؟ اتنی سانجھ۔۔۔ اتنا ساتھ۔۔۔ جن سے میں نے چھوٹی، چھوٹی بات میں مشورہ چاہا۔۔۔ جن کے ساتھ مل کر پھکڑ بازی کی۔۔۔ غزلیں سنیں۔۔۔ بغیر کسی خاص موضوع کے گھنٹوں باتیں کیں۔۔۔ جنہوں نے مجھے، ہمیشہ بیٹا کہہ کر بلایا۔۔۔ مجھے سینے سے لگایا۔۔۔ میرے سر پر ہاتھ رکھا۔

دوسروں کے دکھ، اپنی جھولی میں سمیٹ کر دلاسا دینے والا۔۔۔ اپنی ایک مسکراہٹ کے پردے میں کتنے آنسو چھپائے رکھتا تھا اور جب وہ 'دمکتی ہوئی لو کہانی بنی وہ چمکدار شعلہ فسانہ ہو گیا' تو میں اسے 'جز' گئی۔ کیا میں کم حوصلہ ہوں؟۔۔۔ کیا میں کم ہمّت ہوں؟۔۔۔ خدایا۔۔۔ خدایا!

گزرتے وقت نے، میرے اشک پی لیے۔۔۔ سوختہ لبوں کو سی دیا۔۔۔ لیکن میرے زخم اب بھی رِستے ہیں۔ میرا درد، اب بھی جوان ہے۔

ے ای کہ نزدیک تر از جانی و پنہاں زنگہ
ہجر تو خوشترم آید از وصالِ دگراں[1]

(اقبالؔ)

ایک 'کاش' ہے جو میری جان کے ساتھ لگا ہے۔ کاش بھائی جان زندہ ہوتے تو ہم یوں کرتے۔۔۔ کاش بھائی جان ہوتے تو ایسا ہوتا۔۔۔ یہ تین حرف مجھے مارے ڈالتے ہیں۔۔۔ میں پاگلوں کی طرح دعائیں کرتی ہوں کہ بھائی جان ایک بار آ جائیں۔ ایک بار مل لیں۔ اگر دعاؤں سے مل سکتے، تو اب تک سینکڑوں بار مل چکے ہوتے، لیکن انہوں نے تو کبھی یہ بھی نہ کہا:

ع ہمارے بعد ہیں کچھ لوگ کیسے دیکھ تو آئیں

---

[1] اے آنکھ سے اوجھل تو میری جان سے بھی قریب تر ہے دوسروں کے وصال کی نسبت تیرا ہجر بہتر ہے۔

ے غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اگر ایک دیوانے کے مرنے سے ویرانے پر کچھ گزرتی ہے تو یہاں تو۔۔۔ یہ کہنا ہی فضول ہے کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔۔۔ وہ جن کے بغیر جینے کے تصور سے ہی دم اُلٹتا ہو ان کے بغیر جی کر دیکھ لیا۔ شاید وہ تہی دامن لوگ، جن کا گھیراؤ محبتوں نے نہیں کر رکھا، اسے نہ سمجھ سکیں۔

زندگی Fragile ہے، لاکھ سنبھالو کرچی کرچی ہو جاتی ہے تیز ہوا میں جلتے دِیے کی، لو کو بچاتے بچاتے ہاتھ جلنے لگتے ہیں، لیکن وہ پھڑ پھڑاتا ہے اور بجھ جاتا ہے۔

ooo

ترا کیا اصول ہے زندگی

امی کی زندگی کے آخری چند دن پہلے میں میکے پہنچی تو امی نے کہا۔

''بچیئے۔۔۔ چنگا ہویا تو آ گئی۔''

میں حسبِ عادت، ان کے ساتھ لیٹ گئی۔ ان کا دل مفلوج ہو رہا تھا۔ دو بیٹوں، خاوند اور بھائی (چھوٹے بھائی کی وفات کے سات ماہ بعد میرے بڑے ماموں بھی وفات پا گئے تھے) کی پے در پے اموات کو انہوں نے کیسے برداشت کیا۔۔۔ مجھے آج بھی سکون کی نیند سونے نہیں دیتا۔ انہیں انجائنا کی درد ہوتی تو ہم۔۔۔ ان کی بچی کھچی اولاد، ان کے گرد اکٹھے ہو جاتے تو وہ کہتیں۔

''مجھے کچھ نہیں ہوگا۔۔۔ میں بہت ڈھیٹ ماں ہوں۔''

نہ جینا اپنے بس میں ہے نہ مرنا۔

چین اک پل نہیں۔۔۔ اور کوئی حل نہیں۔۔۔

اور پھر ایسے ہی ایک دن، انہوں نے باری باری، سب کو اپنے پاس بلایا، گلے سے لگایا، پیار کیا اور کہا۔

''میں بھی اللہ کی سپرد اور آپ بھی اللہ کی سپرد۔''

آخر میں ڈاکٹر بھائی سے کہا:

''بیٹا، تم نے میری بہت خدمت کی ہے۔''

انہوں نے بیٹے کے لیے زندگی میں جنّت کی سفارش کی۔ ماں سے بڑھ کر اور کون گواہی دے سکتا ہے؟

چپکے سے آنکھیں بند کیں اور پھر کبھی نہ کھولیں۔ وہ پانچ دن 'کوما' میں رہیں۔ مجھے یہ سوچ کر پسینہ آ جاتا کہ اگر امّی کو کچھ ہو گیا تو؟۔۔۔ اور وہ لمحہ، جب وہ مشتِ غبار، رزقِ خاک ہوئی، میری حیات کے سارے سفر پر بھاری ہے اور میں آج بھی ان سے بچھڑ کر زندہ ہوں۔ ہنستی ہوں۔۔۔ کھاتی پیتی ہوں۔۔۔ پہنتی اوڑھتی ہوں۔۔۔ مالک۔۔۔ یہ کیا ہے؟

ے ترا کیا اصول ہے زندگی؟
مجھے کون اس کا جواب دے

(امجد اسلام امجد)

ooo

چشمِ سُرمہ سا

امّی کے بال بہت لمبے اور خوبصورت تھے۔ مجھے ان سے کھیلنا بہت اچھا لگتا۔ میں انہیں کھولتی، باندھتی، پھیلا دیتی۔ انہیں جھنجلاہٹ ہوتی لیکن کبھی منع نہ کرتیں۔

بچپن کی یادوں میں، امّی کی روشن آنکھیں دمکتی دکھائی دیتی ہیں۔ امّی کبھی کبھار سرمہ لگاتیں تو ان کی بڑی بڑی آنکھیں اور خوبصورت لگنے لگتیں۔ ابا جی دیکھتے تو کہتے۔

''او۔۔۔ ربّ جی''

یہ تعریف کرنے کا، ان کا اپنا انداز تھا۔

امّی کو غسل دیا گیا تو ان کے چہرے پر سرمہ لگی آنکھیں، سب سے نمایاں تھیں۔

ان کو دفن کرنے کی اگلی صبح، میری طبیعت بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ آپا قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔ میں ڈاکٹر بھائی کو تلاش کرتے باہر نکلی تو وہ امّی کی قبر کے پاس بنچ پر اکیلے بیٹھے تھے۔ مجھے گلے سے لگا لیا اور آہستگی سے کہا۔

''امّی کی آنکھوں میں سرمہ کس نے لگایا تھا؟''

OOO

گھُگوں گھُوں۔۔۔

مَیں کھیلتے، میں کہیں گر جاتی اور چوٹ لگ جاتی تو روتی ہوئی امّی کے پاس جاتی۔ وہ میرا ہاتھ اپنی مٹھی میں لے لیتیں (چوٹ چاہے جہاں بھی لگی ہوتی)، اپنے ہونٹ اس پر رکھتیں اور کہتیں؛

''گھُگوں۔۔۔ گھُوں۔۔۔ یوسف کھوہ۔''

حضرت یوسفؑ جب کنویں میں قید تھے تو ایک فاختہ، حضرت یعقوبؑ کے گھر کی دیوار پر بیٹھ کر ایسے بولتی تھی۔۔۔ (یہ بات امّی نے مجھے بتائی تھی)۔

اور میں اپنی تکلیف بھول کر اس گھُگوں گھُوں۔۔۔ کے ردھم میں کھو جاتی۔

چند سال پہلے، جب میں شدید بیمار ہوئی تو دل چاہتا کہ امّی آ کر گھُگوں گھُوں کر دیں۔

لیکن حضرت یعقوبؑ کا ذکر، جب ابا جی نے کیا تو صورتِ حال مختلف تھی۔ چھوٹے بھائی کی وفات کے چند ماہ بعد، ابا جی ایک دن اخبار پڑھ رہے تھے کہ عینک اُتار کر ایک طرف رکھ دی اور رندھی ہوئی آواز میں کہا:

''آج معلوم ہوا حضرت یعقوبؑ کیوں اندھے ہو گئے تھے؟''

OOO

لک ٹُنوٹُنو۔۔۔

سردیوں کی رات ہے۔ رضائی گرم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ امّی مجھے اپنے بستر میں بلا لیتی ہیں۔ محبت کی گرمی، مجھے مدہوش کر دیتی ہے۔ امّی کہانی سناتی ہیں۔

برسات کی رات ہے ٹھنڈی پھوار، برآمدے میں بستر تک آ رہی ہے۔ بجلی زور سے کڑکتی ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ امّی مجھے اپنے بستر میں بلا لیتی ہیں۔ محبت کی چکاچوند سے میری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ امّی کہانی سناتی ہیں۔

"ٹاہلی میرے بچڑّے۔۔۔ لک ٹُنوٹُنو۔۔۔ مینہ آوے گا۔۔۔ بھج جان گے۔۔۔ لک ٹُنوٹُنو۔۔۔ ھنیری آوے گی۔۔۔ اُڈ جان گے لک ٹُنوٹُنو۔۔۔"

امّی آپ کے بچڑّے بھری پری دنیا میں
آپ کے بغیر اُداس ہیں۔۔۔ لک ٹُنوٹُنو
آپ کو یاد کرتے ہیں لک ٹُنوٹُنو۔۔۔ لک ٹُنوٹُنو۔۔۔

ooo

پُتراں دے موڈھیاں تے

جب میری نانی امّاں کی وفات ہوئی تو میں سکول میں پڑھتی تھی۔ تعزیت کے لیے آنے والی خواتین کہتیں۔

"نصیباں والی تھی۔ پتراں دے موڈھیاں تے چڑھ کے گئی ہے۔"

اور میں سوچتی، خاک نصیبوں والی ہیں، وہ تو اس دنیا سے چلی گئیں لیکن جب امّی کی وفات ہوئی تو اتنے سال بعد یہ بات سمجھ میں آئی۔ امّی کو کاندھا دینے والے، صرف ڈاکٹر بھائی تھے یا ایک آٹھ سالہ بھتیجا۔۔۔ اگلی نسل کا واحد مرد۔۔۔ دو بھائی اور ابا جی پہلے رخصت ہو چکے تھے۔

ع آئے نہ پھر وہ لوٹ کر اک بار جو گئے

ooo

کچھ نہیں کُھلتا

جو لمحے گزر جائیں، وہ مڑ کر نہیں آتے، لیکن گزرے ہوئے مناظر، آنکھوں میں تیرتے رہتے ہیں۔ رُتوں کا قاعدہ ہے کہ وقت پر آتی جاتی رہتی ہیں لیکن ان کے قدموں کی چاپ، ذہن کے پردے پر جلترنگ بجاتی رہتی ہے۔ ذرا مڑ کر دیکھوں تو لگتا ہے کہ میں ابھی ہاتھ بڑھا کر انہیں چھو لوں گی لیکن تھوڑی دیر کے بعد، آنکھیں پتھرا جاتی ہیں، ذہن مفلوج ہونے لگتا ہے۔

نظر کے واہمے ہیں یا گماں ہیں!
کچھ نہیں کُھلتا!
ستارے ٹوٹ کر جاتے کہاں ہیں!
کچھ نہیں کُھلتا!

(امجد اسلام امجدؔ)

OOO

درد وِچھوڑے دا حال

ع مائیں نی میں کینوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال

دکھ کبھی کم نہیں ہوتے۔۔۔ صرف ان کی صورت بدل جاتی ہے۔ وقت کی دھول، ان کی تندی کو قابلِ برداشت بنا دیتی ہے لیکن جب، جب اس کی تہہ ہٹائی جائے یہ وہی جان لیوا انداز لیے ہوتے ہیں اور پھر یہ حقیقت کہ سکھ سانجھے لیکن دکھ صرف اپنی ذات تک محدود۔۔۔

میں نہیں جانتی تھی کہ برسوں سے میرے جسم وروح کا حصہ بن جانے والے یہ دکھ کبھی الفاظ کا روپ دھاریں گے۔ اس کے لیے ڈاکٹر بھائی نے مجھے Motivate کیا کہ وہ صرف میرے بھائی ہی نہیں Psychiatrist بھی ہیں۔ میں پچھلے دو سال سے اس کوشش میں مصروف تھی لیکن ایک صفحہ لکھتی اور دس دن Depression کا شکار رہتی۔ شاید وہ احساسات، جو میرے لاشعور میں دفن تھے ان کو باہر لانے کی شعوری کوشش، میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی۔

بہر حال میرے اندر جو کچھ تھا، میں نے اسے صفحات پر انڈیل دیا۔ کسی تصنع، بناوٹ

یا لفاظی کے بغیر۔۔۔ 'جہاں ہے جیسے ہے' کی بنیاد پر۔

اور پھر یہ ہوا کہ Depression میں کمی واقع ہوئی۔ ایک ماہرِ نفسیات کا مشورہ، صحیح ثابت ہوا لیکن اب یہ کہیں آپ کی طرف تو منتقل نہیں ہو گیا؟ بخدا۔۔۔ میرا یہ ارادہ نہیں تھا۔

کاغذاں اُتے لیک لیک کے پُٹھیاں سِدھیاں لیکاں
ہور دھیانے پائیاں ہوئیاں میں اندر دیاں چیکاں

(انجم سلیمی)

ooo

لاجونتی

جس روز میرا رشتہ طے ہوا، مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد میں نے چھما چھم رونا شروع کر دیا۔ چھوٹے بھائی جو خود بھی جذباتی ہو رہے تھے، اپنا سرخ ہوتا ہوا چہرہ لیے، آگے بڑھے اور اپنی مٹھی بند کر کے میرے سامنے مائیک کی طرح رکھ دی اور کہنے لگے۔

''محترمہ اب جبکہ آپ کی بات پکّی ہو چکی ہے تو آپ کے تاثرات۔۔۔؟''

میں زور سے ہنس دی۔

''کیا ہے بھائی۔۔۔ اتنی مشکلوں سے رونا آیا تھا۔۔۔ لے کے سارا موڈ غارت کر دیا۔''

شادی کی تاریخ طے ہو گئی تو گھر بھر تیاری میں مصروف ہو گیا۔ رات کے کھانے کے بعد، ہر ایک اپنے ذمہ لگے کام کی تفصیل بیان کرتا اور اگلے روز کے لیے کام، تقسیم ہو جاتا تو میں کہتی۔

''بھائی اور تو سب ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن مجھے رونا نہ آیا تو کیا ہو گا؟''

سب ہنسنے لگتے۔ چھوٹے بھائی فوراً تجویز پیش کرتے۔

''ایسا کرنا، تم گھٹنوں میں سر دیے ہلتی رہنا۔۔۔ میں تمہارے سر پر ہاتھ پھیر کر، بظاہر تمہیں چپ کرواتا ہوں گا۔۔۔ لیکن دیکھو یہ سب کرنا ضرور۔۔۔ ہماری لاج رکھنا۔''

اور سچ مچ میں، مَیں راتوں کو ہڑبڑا کر اٹھ جاتی۔ صبح میرا تکیہ بھیگا ہوتا۔ اتنے پیارے لوگوں کو چھوڑ کر جانے کا تصور ہی میرے لیے سوہانِ روح تھا۔

ooo

مجھے کچھ نہ سوجھا

بڑے بھائی جان کی شادی ہونے والی تھی۔ میں تب فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی۔ ایک دن، وہ نہا رہے تھے کہ ایمرشن راڈ سے ہاتھ چھو جانے سے انہیں، بہت زور کا کرنٹ لگا۔ وہ زور سے چیخے۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا۔ لیکن نہ جانے کیسے، میں نے سب سے پہلے بجلی کا مین سوئچ بند کیا۔ اس کے بعد، ان کے باتھ روم کے دروازے کے شیشے کو مکا مار کر توڑ دیا اور ہاتھ اندر ڈال کر چٹخنی گرادی۔ بجلی کی سپلائی بند ہو جانے سے، بھائی جان سنبھل چکے تھے۔ دوسرا دروازہ، ابا جی اور آپا نے دھکے دے، دے کر توڑ دیا۔ اس واقعے کا بعد میں جب بھی ذکر ہوتا. بھائی جان کہتے،

''بھلا ہوا ن جاسوسی ناولوں کا جو تم پڑھتی رہی ہو۔ ورنہ یہ سب تمہیں کیسے سوجھتا اور میری جان کیسے بچتی؟''

لیکن جب وہ بستر پر لیٹے لیٹے چلے گئے تو مجھے کچھ نہ سوجھا۔

ooo

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے

(چند یادیں)

مشتاق احمد یوسفی

'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' کو ہم ایک اچھی اور سچی آپ بیتی ان معنوں میں کہہ سکتے ہیں کہ مصنفہ نے جو کچھ دیکھا، بالخصوص بچپن کی آنکھ سے، اسے اپنے دِلنشیں پیرائے میں، بغیر کسی رنگ آمیزی اور حاشیہ آرائی کے پیش کرتی چلی گئیں۔ اسے یادوں اور یاد آوری کا خوب صورت، سیپیا رنگ کا مجموعہ بھی کہہ سکتے ہیں ان کی یادوں میں Total recall یعنی جزئیات و کیفیات کی باز آفرینی کے نقوش صاف نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب اس زمانے کے مہذب، مڈل کلاس معاشرے کے رسم و رواج، اقدار، ادب آداب اور رہن سہن کے سچے اور دِلکش Thumb nail Sketch کا مجموعہ ہے۔ مصنفہ کے لہجے میں حزن و ملال کی زیریں لہر بھی محسوس ہوتی ہے جو قاری کے تبسمِ زیرِ لب کو بہت جلد گلوگیر کیفیت میں بدل دیتی ہے۔

والدین اور بھائیوں کی موت کے غم کی تصویر کھینچتے کھینچتے، اچانک وہ اپنے برش سے ایسا Stroke لگاتی ہیں جو دِل پر پنجے گاڑ دیتا ہے۔

اس کتاب کے بارے میں یہ کہنا درست ہوگا کہ format کے اعتبار سے، یہ

ناول یا مختصر افسانوں کی تعریف میں نہیں آتی۔ روایاتی اصطلاح میں اسے سوانح حیات بھی نہیں کہا جاسکتا۔ ساری کتاب یادوں پر مشتمل ہے اور ہر یاد اپنا format اور لب ولہجہ ساتھ لاتی ہے۔

کسی بھی کتاب کی بنیادی اور سب سے نمایاں خوبی اس کی مطالعیت ہوتی ہے جو صفحۂ اوّل سے آخری صفحہ تک پڑھنے والے کی دِلچسپی برقرار رکھ سکے 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' اس معیار پر اپنے سادہ اور بے ساختہ اندازِ بیان کے باوجود پوری اُترتی ہے۔

حمید اختر

'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' کی مصنفہ نے اپنے بچپن کی یادوں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے اور بظاہر معمولی واقعات اس طرح قلم بند کیے ہیں کہ یہ واقعات، متوسط طبقے کے ایک بھرے پُرے خاندان کی روزمرہ زندگی کا جیتا جاگتا عکس بن کر مجسم شکل میں سامنے آتے اور پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

حسن نثار

'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' نہ ناول ہے نہ افسانوں یا افسانچوں کا مجموعہ، یہ ایک عجیب وغریب سی Non-book قسم کی کتاب ہے۔ ایک بچی کے بچپن' لڑکپن' اور جوانی کی گھریلو قسم کی یادوں پر مشتمل جھلکیوں کا مجموعہ ہے جو آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ چھڑک دیتا ہے۔

جمیل صدیقی

جن خواتین وحضرات نے ۵۰ اور ۶۰ کی دہائی میں سانس لیا ہے۔ ان کے لیے 'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' ان کی اپنی اپنی آپ بیتی بن کر اپنی اثر انگیزی دکھاتی ہے اور دِلوں کو گداز اور آنکھوں کو نم کردینے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

احمد شہباز خاور، ریڈیو پاکستان، فیصل آباد

'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' یادوں کے وہ جگنو ہیں جن کی چمک کبھی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے، کبھی اُشک بن کر اُمڈتی ہے اور کبھی روشنی کی وہ لکیر بن جاتی ہے جو محبت، عزم و عمل، ایثار و قربانی اور زندگی کی دھوپ چھاؤں سے عبارت ہے۔

انجم خلیق، ریڈیو پاکستان، اسلام آباد

'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' کا اندازِ بیان اور واقعات کی عمومیت اتنی متاثر کُن اور بے ساختگی کی آئینہ دار ہے کہ کتاب پڑھتے ہوئے ہر قاری اسے اپنی کتاب سمجھتا ہے۔

پروفیسر صادق حسین

'پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو اس میں پیاروں کے بچھڑنے کا غم، بے رحم موت اور زندگی کی حقیقت کا بے لاگ تبصرہ واضح نظر آتا ہے۔ پلاٹ، کردار اور منظر نگاری، زبان و بیاں اور اسلوب کی خوبیاں قاری کو بے حد متاثر کرتی ہیں۔

رسالہ 'مرہم' سوشل سکیورٹی ڈاکٹرز ایسوسی ایشن، فیصل آباد

منزہ سلیم پھولوں، خوشبوؤں، جگنوؤں اور معصوم شرارتوں کا ذکر کرتے ہوئے اچانک غم کے بحرِ بے کراں میں غوطہ لگاتی ہیں تو قاری کو ساتھ ہی بہا لے جاتی ہیں۔ یہ کہانی ہمارے ہر گھر کی کہانی ہے۔ یہ ہمارے تمہارے اندر، ہماری تمہاری کہانی ہے۔

پروفیسر آفاق صدیقی، رسالہ ہمدرد صحت

یہ کتاب اوّل تا آخر سوانحی ادب کی مثالی کتاب ہے، جس میں کوئی مصنوعی غم انگیزی نہیں اور خوشی کے لمحوں کا انعکاس بھی بڑی موزونیت کے ساتھ خوب صورت عبارت آرائی کی شکل میں نظر آتا ہے۔

انہیں کیا خبر کسی دھنک سے میرے
رنگ آئے
انہیں کیا خبر کون سی تتلیوں کے پروں سے
انہیں کیا خبر کون سے حسن سے
کون سی ذات سے، کس خدوخال سے
میں نے کوزوں کے چہرے اُتارے

یہی وہ ندا جس کے پیچھے حسن نام کا یہ جواں
کوزہ گر بھی
پیاپے رواں ہے زماں سے زماں تک

میں ہوں اس کہانی کا ڈاکٹر بھائی

مقبول اختر